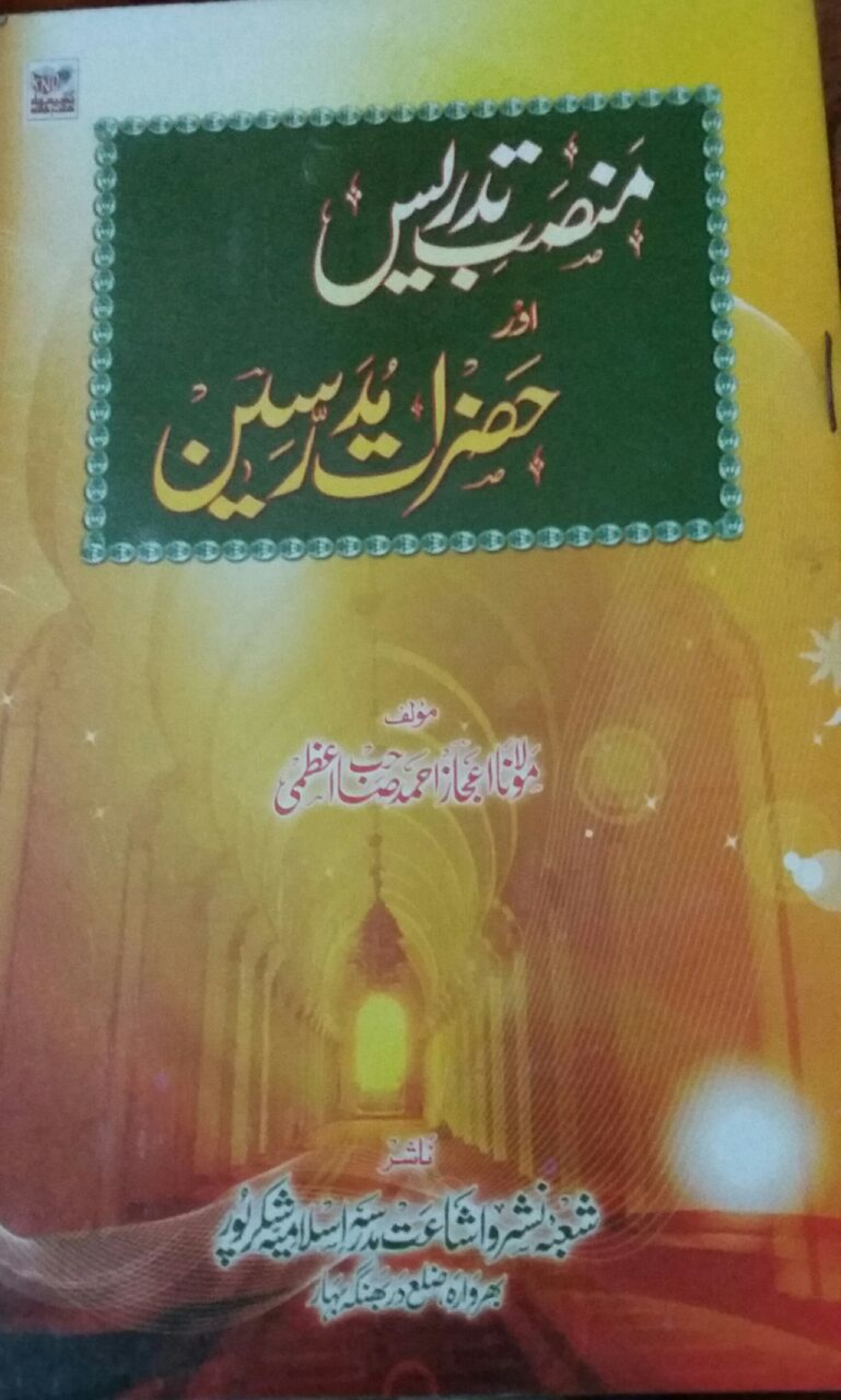

منصبِ تدریس

اور

حضراتِ مدرسین

مولف

مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی

ناشر

شعبۂ نشر و اشاعت مدرسہ اسلامیہ شکرپور
بھرواڑہ ضلع دربھنگہ بہار

منصبِ تدریس

اور حضراتِ مدرسین

مولف

حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی

ناشر
شعبۂ نشر و اشاعت، مدرسہ اسلامیہ شکر پور
بھروارہ، ضلع دربھنگہ بہار

تفصیلات

نام کتاب : منصبِ تدریس اور حضراتِ مدرسین
مؤلف : حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی
صفحات : 80
طبع اول : جولائی ۲۰۰۹ء
ناشر : شعبۂ نشر واشاعت مدرسہ اسلامیہ شکر پور
زیر نگرانی : مولانا ضیاء الحق خیر آبادی
قیمت : 40/=
ای میل: zeyaulhaquekbd@gmail.com

ملنے کے پتے

☆ مکتبہ ضیاء الکتب، خیر آباد، ضلع مئو (یوپی) 9235327576
☆ فرید بک ڈپو پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲
☆ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند
ے ☆ مکتبہ الفہیم صدر چوک مئو ناتھ بھنجن 9236761926
☆ مولانا محمد خالد قاسمی مکتبہ دار ارقم، اسلام آباد (ڈکہا) جون پور 9554983430

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتساب

ان نونہالانِ علومِ نبوت کے نام

جو بساطِ تدریس پر تازہ وارد ہوئے ہیں یا وارد ہونے والے ہیں۔ ان میں میرے فرزند بھی ہیں، میرے طلبہ بھی ہیں، اور دوسرے اہل محبت و خدمت بھی ہیں، جن کے قلوب قرآن و سنت پر مر مٹنے کے جذبات سے سرشار ہیں۔

جوانوں کو مری آہِ سحر دے　　پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدا یا آرزو میری یہی ہے　　مرا نورِ بصیرت عام کر دے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

یہ بندہ خاکسار، جب سے اس نے ہوش کی آنکھ کھولی ہے، اپنے آپ کو مدارس دینیہ اسلامیہ کے حصار میں پا رہا ہے، بچپن اسی حصار میں گزرا، جوانی کی عمر اسی حصار میں کٹی، اب بڑھاپا بھی یہیں گزر رَہا ہے۔ حق تعالیٰ سے دعا والتجا کرتا ہوں کہ عمر کا جتنا حصہ باقی ہے وہ بھی اسی حصار میں بخیر وخوبی گزرے۔ بزرگوں سے بھی، دوستوں سے بھی اور ان سے بھی جنھوں نے اس ظلوم وجہول کو اپنے لئے معلم واستاذ بنایا، یہی درخواست ہے کہ میرے حق میں یہ دعا ضرور کریں۔

مدرسوں میں رہ کر میں نے اور کچھ سیکھا ہو یا نہ سیکھا ہو لیکن اتنی بات میرے دل میں بطور حق الیقین کے راسخ ہوگئی ہے کہ یہ مدارس باوجود اپنی بہت سی اندرونی کمزوریوں کے، اس دور میں دین اسلام کی حفاظت کے لئے مضبوط قلعے ہیں، جو خدائی نصرت واعانت کے ماتحت چل رہے ہیں، حق تعالیٰ کو اپنے دین کی بقا منظور ہے، اس کا کام انھیں مدارس سے لے رہے ہیں۔ آج جو حضرات ‘‘علماء کرام’’ کے معزز لقب سے یاد کئے جاتے ہیں، اور جن سے دین کے احکام ومسائل زندہ ہیں، وہ سب انھیں مدارس کے پروردہ ہیں۔

یہ مدارس جن عناصر سے مرکب ہیں، ان میں اہم ترین عنصر اساتذہ ومعلمین کا ہے، طلبہ اپنے دل ودماغ کی سادہ تختیاں اور اپنے مزاج وطبیعت کی بے رنگ استعداد، ان اساتذہ کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ ان پر یہ حضرات علم وحکمت کے ان نقوش کو مرتسم کریں،

جو انھیں بطریق تواتر رسول اللہ ﷺ سے حاصل ہوئے ہیں، اور ان بے رنگ استعدادوں میں وہ رنگ بھر دیں، جسے ’’صبغۃ اللہ ‘‘ (اللہ کا رنگ) کہا جاتا ہے، اساتذہ کی ذمہ داریاں اس لحاظ سے نازک ہیں، ان کا رتبہ بلند ہے، تو ان کے فرائض بھی بہت اہم ہیں۔

میں مدرسوں میں پہلے متعلم کی حیثیت سے رہا ہوں، اور اب عرصہ سے معلم کی حیثیت سے ہوں، نظم وانتظام سے میرا تعلق صرف ضرورت کے بقدر رہا ہے، مدرسی کے تجربات بہت ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے مجھے جو اولادیں عطا فرمائیں، انھیں بھی میں نے اللہ کے بھروسے مدارس ہی کے حوالے کیا، بلکہ انھوں نے مدارس کی چار دیواری میں ہی آنکھ کھولی ہے، ہر چیز سے پہلے انھوں نے مدرسہ ہی کو دیکھا اور جانا ہے۔ روزی رساں اللہ تعالیٰ ہیں، میری آرزو ہمیشہ یہی رہی ہے کہ یہ دین کی خدمت میں اپنے آپ کو فنا کر دیں۔

میں عرصے سے سوچ رہا تھا کہ مدرسین کے فرائض اور ذمہ داریوں سے متعلق ایک تحریر مرتب کروں، جس سے مجھے بھی فائدہ پہونچے اور ان دوستوں کے بھی کام آئے، جو خدمت کے اس راستے پر چل رہے ہیں، ادھر چند ماہ سے میرے کئی دوست اور میرے فرزند، جو ایک تازہ اور جدید مدرسہ، جو شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی نور اللہ مرقدہٗ کے نام نامی سے منسوب ہے، میں انتظامی اور تدریسی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں، بار بار یاد دلاتے رہے کہ اس موضوع پر کچھ کہئے، کچھ لکھئے۔

میں بھی سوچتا رہا کہ لکھوں، لیکن کیونکر لکھوں، کیا اُسلوب اختیار کروں؟ پھر بطور مقالے کے اسے لکھنا شروع کر دیا تھا کہ دفعۃً دل میں یہ بات آئی کہ میرے فرزند عزیز مولوی حافظ محمد راشد سلّمہٗ ایک سال قبل دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہو کر آئے ہیں، اور سال بھر سفر حضر میں میرے ساتھ رہے ہیں، ان سے اس موضوع پر متعدد بار گفتگو ہوئی، اب وہ تدریس کی خدمت پر فائز ہونے والے ہیں، میں نے سوچا کہ اس موضوع کا مخاطب انھیں کو بنا کر تحریر مرتب کروں، چنانچہ یہ مقالہ بشکل مکتوب مرتب ہو گیا، فرزند عزیز کی مخاطبت نے میرے لئے

کچھ ایسے تجربات اور کچھ ایسی آپ بیتیوں کو لکھنا سہل کر دیا، جنھیں میں لکھنا چاہتا تھا مگر عام مقالہ ومضمون میں ان کے لئے کیا طرز واسلوب اختیار کروں؟ یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، اللہ نے یہ مشکل مکتوب کی شکل میں آجانے کی وجہ سے حل کر دی، **وللّٰہ الحمد**

اس مکتوب کے مضامین اصلاً مدارس عربیہ اسلامیہ کے حضراتِ اساتذہ ومعلمین کو پیش نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں، لیکن ان کی افادیت مسلمانوں کے ہر طبقہ کے لئے عام ہے، اساتذہ بھی، اہل انتظام بھی، طلبہ بھی، اور دین سے محبت رکھنے والے حضرات بھی، سب ان شاءاللہ اپنے حق میں اسے مفید پائیں گے۔

ابتداء میں یہ خیال تھا کہ اسے مختصر کتابچہ کی شکل میں شائع کیا جائے، مگر پھر یہ خیال ہوا کہ ماہنامہ ضیاء الاسلام میں اسے مکمل شائع کر دیا جائے، اور اسے ماہنامہ کا خصوصی نمبر بنا دیا جائے، تاکہ تمام خریداروں کے ہاتھ میں پہونچ جائے، پھر جو صاحب یا جو ادارہ مناسب سمجھے اسے چھاپ کر اس کے افادہ کو عام کرے، یہ خصوصی اشاعت عام شماروں سے آٹھ صفحے زائد ہے۔

یہ مکتوب ایک پرانے تجربہ کار خادم علم دین کی طرف سے، ان نوآموز حضرات کی خدمت میں ایک خصوصی تحفہ ہے، جو ابھی خدمت دین علم کے میدان میں نووارد ہیں، یا اس میدان میں اترنے کی تیاری کر رہے ہیں، خدا کی ذاتِ عالی سے امید ہے کہ اس کے ذریعے سے ان حضرات کے لئے آگے بڑھنے کا صحیح رخ متعین ہوگا، اور یہ حضرات دین اور علم دین کی خدمت کر کے دنیا میں بھی سرخروئی حاصل کریں گے، اور آخرت کے بلند درجات بھی انھیں حاصل ہوں گے۔ میرا تجربہ ہے، اور دوسروں کی زبانی بھی بارہا سننے میں آیا، اور خود قرآن وحدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ آدمی کے مشاغل ومصروفیات میں افضل ترین اور مفید ترین مصروفیت تدریس کی ہے، اس کے ذریعے سے دنیا میں جو وقار ملتا ہے اور جو عزت حاصل ہوتی ہے، اس کے سامنے دوسری تمام عزتیں ہیچ ہیں۔ سچے بے لوث محبت

کرنے والے، خدمت کر کے شکر گزار ہونے، استاذ کی خوشی کو متاعِ زندگی سمجھنے والے مخلص افراد جتنے اس دائرۂ عمل میں ملتے ہیں اور کہیں نہیں ملتے، اور آخرت کی آبرو تو مقصود ہے وہ بھی اس راہ سے بدرجۂ کمال حاصل ہوگی، **ان شاء اللہ**

لیکن واضح ہو کہ ہمارا موضوعِ گفتگو علم دین ہے، علم دنیا نہیں۔

یا اللہ! اپنے فضل و کرم سے اس کے مرتب، اس کے مخاطب اور اس کے قاری سب کو اپنی خاص نگاہِ رحمت سے نواز دیجئے۔ علم دین کی روشنی کو عام فرما دیجئے، اور جو لوگ اس روشنی کے حامل اور امین ہیں انھیں اپنی خاص بارگاہ میں باریابی بخشئے، اور پیغمبر ﷺ کے نقش پر چلائیے، اور اس پر استقامت عطا فرمائیے، **آمین یا رب العالمین**

اعجاز احمد اعظمی

۱۵؍رجب ۱۴۳۰ھ

* * *

منصبِ تدریس اور حضراتِ مدرسین

الحمدللہ رب العا لمین و الصلاۃ و السلا م علیٰ سیدنا محمد
و آلہ و صحبہ اجمعین، اما بعد

فرزند عزیز ! **وفقنی اللہ و إیاک لمایحبہ ویرضاہ**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہاری اور ہماری حیات کتنی ہے، اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے، زندگی کا جو حصہ گزر گیا، اسے ہم نے جان لیا اور جو آنے والا ہے وہ نامعلوم ہے، جو وقفہ گزر کر ماضی بن گیا، وہ زندگی کا ایک مرحلہ تھا، یہ مرحلہ رسمی طالب علمی کا تھا، رسمی اس لئے کہ علم ایک بحر ناپیدا کنار ہے، اس کی طلب سے کوئی بھی عالم کبھی فارغ نہیں ہوسکتا، جتنا وہ سیکھ چکا ہوتا ہے اسی کی روشنی میں دیکھتا ہے، کہ ابھی بہت کچھ ہے جو اس کے احاطۂ علم سے باہر ہے، اس لئے اگر وہ علم کا شائق ہے اور اس کی کسی حد پر قناعت کر کے بیٹھ جانے والا نہیں ہے تو وہ ہمہ دم گرم جستجو رہتا ہے، اور جہاں تک پہونچتا ہے اس کی نگاہِ جستجو آگے کی طرف لگی رہتی ہے ے

ہم وہ رَہرو ہیں کہ چلنا ہی ہے مسلک جن کا

امام دارمیؒ نے حضرت حسن بصری علیہ الرحمہ کا ایک ارشاد نقل کیا ہے، فرماتے ہیں:

منهومان لایشبعان ،منهوم فی العلم لایشبع منه ومنهوم فی الدنیا لایشبع منها ۔ (سنن دارمی، **باب فی فضل العلم والعالم**) دو حریص ایسے ہیں جو کبھی آسودہ نہیں ہوتے، ایک علم کا حریص کہ اس سے کبھی سیر نہیں ہوتا، ایک دنیا کا حریص کہ وہ بھی کبھی آسودگی نہیں پاتا۔

امام دارمی نے یہ ارشاد حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کا بھی نقل کیا ہے۔

غرض یہ کہ حقیقی طالب علمی تو تادم رخصت قائم رہتی ہے، لیکن رسمی طالب علمی جو کہ عبارت ہے ہر مشغلہ سے یکسو ہو کر تحصیل علم میں مشغول ہونے، اساتذہ کے حضور میں زانوئے ادب تہ کرنے اور تعلیم وتدریس کے مخصوص ماحول میں سمٹے رہنے سے، وہ مرحلہ اب اختتام کو پہونچا۔

اب تمہاری طالب علمی ایک دوسرے مرحلے میں داخل ہوئی ہے، یہ ہے تعلیم وتدریس کا مرحلہ! یہ مرحلہ پہلے مرحلے سے زیادہ نازک، اور ذمہ داریوں کے ساتھ زیادہ گرانبار ہے، ان نزاکتوں، ذمہ داریوں کو سمجھنا اور نبھانا ایک مشکل عمل ہے، مگر اللہ تعالیٰ جس کے لئے آسان فرمادیں۔

تم نے پوچھا ہے کہ اس مرحلہ میں تمہیں کیا طریقۂ کار اختیار کرنا چاہئے کہ دنیا میں بھی سرخرو رہو اور آخرت میں بھی فلاح حاصل ہو، اس سوال کا جواب میں تمہیں تفصیل سے دوں گا، میں رسمی طالب علمی کے بعد تعلیم وتدریس کے مرحلے میں ۱۳۹۱ھ کے آغاز سے داخل ہوں، کچھ دن اس طرح گزرے کہ میں طالب علموں کو پڑھاتا تو ضرور تھا، مگر وہ کسی مدرسہ کی ضابطہ کی مدرسی اور ملازمت نہ تھی، یہ سلسلہ کم وبیش ڈیڑھ سال رہا، اس وقفہ میں مَیں تھا اور میرے طلبہ تھے، اور کسی تیسرے کا اس میں دخل نہ تھا۔

ایک قلیل وقفہ چند ماہ کا ایسا بھی گزرا، جب میں ایک مدرسہ میں مدرس ہوا، مگر بطور

ملازمت کے نہیں بلکہ اعزازی طور پر، پھر ۱۳۹۳ھ کے اواخر سے باقاعدہ ایک مدرسہ میں ملازمت اور تنخواہ والی تدریس کا آغاز ہوا۔

میں دورِ طالب علمی میں مکتبی تعلیم کو مستثنیٰ کر کے چھ برس عربی مدارس کی چہار دیواری میں رہا ہوں، پھر ڈیڑھ دو سال کے وقفہ کے بعد اڑتیس سال سے مسلسل مدرسوں میں ہوں، طالب علمی تین مدرسوں میں بسر ہوئی، مدرسی چار مدرسوں سے ہوتی ہوئی پانچویں مدرسے میں بیس سال پورے کر چکی ہے، تجربہ اور آزمائش کا ایک خاصا طویل وقفہ گزار چکا ہوں، اس عرصہ میں جو کچھ پڑھا، پڑھایا، دیکھا، لوگوں کو برتا، مختلف سرد و گرم مرحلوں سے گزرا، تلخ و شیریں معاملات کا تجربہ کرتا رہا، انھیں قرآن وحدیث اور اسلاف کی سیرتوں کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی، تو مزاج وطبیعت کا خاص رنگ بن گیا ہے، اسی رنگ و مزاج کے تحت کچھ باتیں، کچھ تجربے، کچھ نصیحتیں لکھتا ہوں، شاید تم کو کچھ نفع ہو، کام کرنے کی راہ کھلے، اور شاید میرے لئے بھی نافع ہو۔ لعل اللہ۔۔۔۔

کیا تدریس ذریعۂ معاش ہے؟

تم رسمی طالب علمی سے فارغ ہو کر تدریس کے لئے مدرسہ میں قدم رکھ رہے ہو، تو یہ بات کبھی سوچی کہ مدرسہ میں تدریس کی خدمت کے لئے قدم رکھنا کیا عبادت ہے؟ کیا یہ تمہارا دینی فریضہ ہے؟ یا یہ ایک ذریعۂ معاش ہے؟ جس سے تم اپنی، اپنے گھر والوں اور اپنے والدین کی روزی مہیا کرو گے، ان کی خدمت کرو گے؟ تم نے مدرسہ میں رہ کر جو علوم حاصل کئے ہیں، اور ان کے جو فضائل وامتیازات اساتذہ سے اور علماء سے سنے ہیں ان کا حاصل اور تقاضا یہ ہے کہ علم دین کی تعلیم و تدریس ایک خالص دینی اور عبادتی کام ہو، تم نے سنا ہوگا، بلکہ تم نے دوسروں سے کہا بھی ہوگا کہ تعلیم دین اور تعلیم قرآن بجائے خود ایک دینی فریضہ ہے، یہ دنیاوی اجرت اور مزدوری سے بے نیاز بلکہ برکنار ہے۔ متقدمین اکابر سلف

نے اس کو جائز نہیں رکھا ہے، احادیث میں اس کے اشارے بھی ملتے ہیں، بلکہ صراحت بھی ہے، البتہ متاخرین نے ضرورت کی بنیاد پر اس کی اجازت دی ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ تعلیم وتدریس کو معاش سے نہ جوڑا جائے، چنانچہ عہد سلف میں اور اس کے بعد دنیا میں انگریزوں کے تسلط سے پہلے اصحاب علم کے درمیان عام فضا یہی رہی ہے کہ لوگ للہ فی اللہ طالبان علوم نبوت کی خدمت کرتے تھے، ان میں بعض ممتاز اہل علم و دین کے لئے مسلمان حکومتوں کی جانب سے کچھ جاگیریں عطا ہوتی تھیں، کچھ وظائف بھی مل جاتے تھے، مگر تعلیم وتدریس کا مشغلہ ان کے لئے ذریعۂ معاش نہ ہوتا، تعلیم وتعلم کا طور اس دور میں عموماً یہی ہوتا۔ بعض علماء سرکار و دربار کی ملازمت اختیار کرتے، بعض اوقاف سے مستقل وظیفہ یاب ہوتے، اہل تدریس میں ان کی تعداد کم ہوتی، اور جو لوگ ملازمت و وظائف کی طرف رُخ کرتے وہ بیشتر اپنا علمی و دینی وزن مسلمانوں کے قلوب سے کھو دیتے، قدر و منزلت انھیں مدرسین کی ہوتی جو اجرت اور مزدوری سے کنارہ کش ہو کر علم اور دین کی خدمت کرتے اور انھیں کا فیض عام بھی ہوتا، میرے اس اجمال کو چاہو تو تاریخ اور تذکروں کے اوراق میں ڈھونڈھ سکتے ہو۔

انگریز اور انگریزی تہذیب کا سیلاب دنیا میں آیا، تو اس نے تمام پچھلی اچھی قدروں پر ہلہ بول دیا، اس تہذیب میں آخرت اور جنت دوزخ کا کوئی تصور چونکہ نہیں ہے اس لئے اس نے تمام اعمال وخدمات کو معاش کے ساتھ جوڑ دیا، اور چونکہ اس ’’عاجلہ‘‘ میں فوری سود و زیاں کا مسئلہ ہے، اس لئے دین سے دور اور کمزور طبیعتیں اس پر ٹوٹ پڑیں، اس تہذیب کی بدتہذیبی کا اثر یہ ہوا کہ ہر وہ کام اور ہر وہ خدمت جس سے کوئی معاشی نفع وابستہ نہ ہو، قطعاً لائق التفات نہیں رہا، ہمارے موجودہ دور میں ’’معاشی اکتساب‘‘ کی وہ حکمرانی ہے کہ آدمی کسی میدان میں اسی وقت قدم رکھتا ہے جب یہ اطمینان کر لیتا ہے کہ کامیاب ہوگا جب بھی معاش کا انتظام ہوگا اور ناکام ہوگا جب بھی معاش کی راہ کھلے گی، مال و دولت کمانے کی جو دوڑ اس عہد میں چل رہی ہے، ہم لوگ اس کا تصور نہیں کر سکتے۔

پیغمبروں اور انبیاء **صلوات الله وسلامه عليهم** نے اپنی قوموں سے ایک بات کہی تھی: **وما أسئلكم عليه من أجرٍ إن أجري إلا على الله** (میں تم سے کسی بدلے کا سوال نہیں کرتا، میرا معاوضہ تو اللہ کے حوالے ہے) انبیاء کا یہ فرمان قطعاً نظر انداز کر دیا گیا، اب تمام تر معاوضہ اسی دنیا میں اور لوگوں ہی سے چاہئے۔

انگریزوں کی خدا فراموشی نے ہر ایک کو معاش کی چوکھٹ پر سجدہ ریز کر دیا، مادہ پرستی کے اس دور بھی میں آخرت کے اجر وثواب کے امیدوار بہت تھے، لیکن ظلمت کا سایہ آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ میں تمام دنیا کی بات نہیں کرتا، ہندوستان میں علماء ختم ہو رہے تھے، ان کی درسگاہیں ویران ہو رہی تھیں اور جو طوفان اٹھ چکا تھا اور اس کا دائرہ بڑھ رہا تھا، دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ بہت جلد علم دین، جس کی بنیاد ''اجر آخرت'' پر ہے، فراموشی کی نذر ہو جائے گا۔

اللہ کی حکمت بالغہ کو دین اور علم دین کا تحفظ منظور تھا، ایک ایسی تدبیر قلوب پر القاء ہوئی کہ علم دین بھی باقی رہے اور اس کی بنیادی اینٹ یعنی **إن أجري إلا على الله** بھی باقی رہے، اور معاش کا مسئلہ بھی قدرے اسی راہ سے حل ہو جائے۔

چنانچہ دار العلوم دیو بند کے طرز کے مدارس الہام ہوئے، ان مدارس میں تعلیم کی بنیاد خالصۃً للہ رہی، لیکن پڑھنے پڑھانے والوں کی معاش کا بھی قدرے انتظام کر دیا گیا۔ اور اس کے لئے ان مدارس کو عوامی حلقوں کے ساتھ مربوط کر دیا گیا، مسلمانوں کی حکومت ختم ہو رہی تھی، نئی حکومت وہی تھی جس کے جلو میں یہ تمام دُنیوی طوفان چل رہے تھے۔ ان حکومتوں سے تو امداد نہیں لی جا سکتی تھی، عوامی حلقوں سے حصول خیر کا انتظام کیا گیا اور علم دین کی بقاء وتحفظ کی راہ ہموار کی گئی۔

مدارس میں تنخواہ کی شکل میں جو معاش کا انتظام کیا گیا تھا، وہ ایک ناگزیر ضرورت تھی، اصل مدار اللہ کے لئے تدریس وتعلیم پر تھا، چنانچہ مدارس کی ابتداء میں بکثرت ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ اہل انتظام ایک مدرس کی تنخواہ بڑھانا چاہتے ہیں اور وہ مدرس انکار کر رہا

ہے، اور اضافہ کو قبول نہیں کیا۔

تمہیں حیرت ہوگی، ایسے مخلصین کو میں نے بچشم خود بھی دیکھا ہے، بڑے اکابر کی بات نہیں کرتا۔ ایک غیر معمولی نہیں، معمولی مولوی ایک مسجد میں امام ہے، مسجد سے ملحق ایک مکتب ہے، اس میں تعلیم بھی دیتا ہے، اور تنخواہ کل سو روپئے ہے، یہ آج کی تاریخ سے چالیس سال قبل کی بات ہے، اس مولوی کے انتظام اور تعلیم کی برکت سے مدرسہ کا چندہ خاصا بڑھ گیا، اہل انتظام نے اس امام اور مدرس کی عدم موجودگی میں مشورہ کرکے تنخواہ ڈبل کردی، جب وہ امام آیا تو اسے معلوم ہوا، اس نے سب اہل مشورہ کو جمع کیا، اور معذرت کردی کہ میرے لئے وہی تنخواہ بھاری پڑ رہی ہے، میں اپنے کو اور بوجھل کیوں کروں؟

لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا، قلوب سے یہ اثر کمزور ہوتا گیا، سامنے سرکاری اور انگریزی مدرسوں کا متوازی نظام بھی چل رہا ہے، جس کا سارا لب لباب تحصیل معاش ہے، ان میں اساتذہ بڑی تنخواہیں پاتے ہیں، اتنی بڑی کہ دینی مدارس کا ایک مدرس پورے سال میں جتنی تنخواہ پاتا ہے، کالج کا ایک لیکچرر اور پروفیسر اس سے زیادہ تنخواہ ایک ماہ میں سمیٹ لیتا ہے، پھر سرکار دربار نے ایک دام ہمرنگ زمین اور پھینکا، ان دینی اور عربی مدارس کو امداد و تعاون سے نوازا، اور یہ مدارس تعاون لے کر محض ذریعۂ معاش بن کر رہ گئے۔ ان تعاون زدہ مدارس سے دین کی روح تو نکل گئی، یا بہت کمزور پڑ گئی، البتہ معاش کی جہت قوی ہوگئی، پہلے مدارس کی تنخواہ ایک ناگزیر ضرورت تھی، اب وہ مقصود و معاش بن گئی ہے۔

اب رہ گئے وہ مدارس جو حکومت کے تعاون سے برکنار ہیں، وہ ابھی تک دین کو اور علم دین کو ایک حد تک سنبھالے ہوئے ہیں، ان میں تنخواہ کی اب بھی وہی ”ناگزیری“ حیثیت برقرار ہے، لیکن باہر کی گرم گرم ہوائیں یہاں بھی داخل ہو رہی ہیں اور یہاں کے دینی و اخروی جذبات کو جھلس رہی ہیں، اب کتنے طلبہ ہیں جو طالب علمی سے فراغت پاکر معاش ہی کے لئے ان مدارس میں داخل ہوتے ہیں، معاش کے اس تصور اور نظریے نے

مدرسوں میں اہل انتظام کے لئے مالکانہ حیثیت اور اساتذہ کے لئے ملازمانہ ذہنیت کا نظریہ ابھارا، اور اس کی پرورش کی۔ اس نظریہ نے مدارس میں تین فریق پیدا کردئے، حالانکہ یہ تینوں باہم رفیق ہیں، اور ان کی رفاقت سے بہت عمدہ نتائج کی توقع ہے، ایک فریق دفتر اہتمام ہے، دوسرا فریق اساتذۂ کرام ہیں، تیسرا فریق وہ لوگ ہیں جو مدرسے کے انتظام سے متعلق خدمات میں ہیں، جیسے منشی، سفیر، باورچی، چپراسی وغیرہ، اور پھر ان تینوں سے جڑا ہوا ایک حلقہ طلبہ کا ہے، جو عام حالات میں مناسب ماحول پاتا ہے، تو تعلیمی دلچسپیوں میں لگا رہتا ہے، لیکن بعض مخصوص حالات میں یہ بھی فریق بن جاتا ہے، خیر اس موضوع پر گفتگو بعد میں ہوگی، ان شاء اللہ

اسی پس منظر میں مَیں نے پوچھا ہے کہ تم نے کیا سوچا ہے؟ علم اور دین کی خدمت کو مقصد بنا کر تدریس کے میدان میں قدم رکھا ہے؟ یا اسے تم ذریعۂ معاش سمجھ رہے ہو؟

اب میری سنو! تم کو معلوم ہے کہ میں اپنی طالب علمی کے آخری مرحلہ میں بعض ناگفتنی احوال میں مبتلا ہوگیا تھا، ان احوال کا میرے اوپر اتنا شدید تاثر تھا کہ میں سوچنے لگا تھا کہ اب مدرسہ میں واپس نہیں ہونا ہے، اس سوچ کے بعد قدرتی بات تھی کہ مجھے سوچنا تھا کہ معاش کے لئے مجھے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے، میں نے اس سلسلے میں مسلسل ڈیڑھ سال تک استخارہ کیا، اور نتیجہ یہ نکلا کہ روزی حاصل کرنے کے تمام دُنیوی ذرائع سے دل اچاٹ ہوگیا۔ اسی دوران ایک صاحب دل اور صاحب نسبت بزرگ سے مشورہ لیا، تو انھوں نے نہایت قطعیت سے فرمایا کہ آپ مدرسہ میں لوٹئے، پھر میری طبیعت یکسو ہوگئی، اور مشیت الٰہی نے مجھے ایک مدرسہ میں پہونچادیا۔

جب ارادے کا انتشار ختم ہوا، اور مدرسہ میں جانا عزم بن گیا، تب میں نے فکر معاش کو بھی دل سے نکال دیا۔ مدرسہ میں داخل ہونے کا مقصد یہ ٹھہرایا کہ دین اور علم دین کی خدمت کرنی ہے، عام دستور کے مطابق کچھ نہ کچھ تنخواہ تو ملے گی، وہ معاش کی ایک مدد

ہو جائے گی مگر نہ وہ مقصود ہوگی، نہ مطمح نظر! مجھے دین کی خدمت کرنی ہے، تنخواہ ہو یا نہ ہو! کم ہو یا زیادہ ہو! اپنی زبان سے نہ تنخواہ کا مطالبہ کروں گا نہ دل اس پر لگاؤں گا۔ مدرسہ میں نہ میں ملازم ہوں گا، نہ حاکم ہوں گا، صرف دین اور علم کا خادم رہوں گا۔ ’’حیلۂ روزی‘‘ تنخواہ کی شکل میں ہوگی، کافی یا ناکافی، اس سے بالکلیہ قطع نظر، پھر جو کچھ ضرورت ہوگی بجائے کوئی دنیوی ظاہری ذریعہ اختیار کرنے کے محض رزاق مطلق سے دعاء والتجا کروں گا، اس عزم وارادہ کے ساتھ مدرسہ میں قدم رکھا، اب مدرسہ میں اڑتیسواں سال پورا ہونے کو ہے، بحمد اللہ میرے اس عزم وارادہ کو اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل رہی، جب میں مدرسہ میں داخل ہوا تھا، تو بہت ہلکا پھلکا تھا، اب ایک وسیع وعریض کنبہ میرے ساتھ ہے، لیکن کبھی نہیں ہوا کہ میں نے کسی خاص تنخواہ کا تقاضا کیا ہو، یا زبان وقلم سے کبھی تنخواہ مانگی ہو، یا تنخواہ بڑھانے کا کبھی تصور کیا ہو، لیکن اپنے پروردگار کا کس زبان سے شکر ادا کروں کہ انھوں نے تمام کارِ دنیوی کو سہل فرمایا، اور خدمت دین کے لئے فارغ رکھا۔ روزی کی الجھن کبھی دامن گیر نہیں۔

اپنی آپ بیتی میں نے مختصراً اس لئے لکھ دی کہ تمہارے لئے بھی راستہ کھلے، اب پھر سنو! مدرسہ میں داخل ہوئے ہو، تو مقصد صرف خدمت دین اور خدمت علم دین کو بناؤ، مدرسہ والے دستور کے مطابق کچھ نہ کچھ تنخواہ دیں گے، اس تنخواہ کو اپنا حق مت سمجھو، محض عطیۂ الٰہی سمجھو، اور یہ یقین کرو کہ تمہاری روزی جو حق تعالیٰ کی طرف سے متعین ہو چکی ہے اس کا ایک حصہ اہل مدرسہ کی طرف سے تمہیں مل رہا ہے، یہ اتنا حصہ نظر آ رہا ہے، باقی غیب میں ہے، اور غیب کی چیز شہود سے زیادہ قطعی اور یقینی ہے، کیونکہ مومن کے ایمان کا تمامتر مدار غیب ہی پر ہے، پس جو کچھ غیب میں ہے اسے یقینی سمجھ کر اللہ تعالیٰ سے اس کا سوال کرو، دیکھو حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے نکلے ہیں تو ایک لمبی مسافت طے کر کے مدین پہونچے تھے، تھکے ماندے، اجنبی جگہ، اجنبی لوگ، مگر دو عورتیں خدمت کی محتاج تھیں انھوں نے ان کی خدمت کر دی، اور بہت اچھی طرح خدمت کی، لیکن ان سے اس خدمت کے معاوضہ کا تصور

تک نہ کیا، وہ اپنی بکریاں لے کر چلی گئیں، اور موسیٰ علیہ السلام ایک سایہ دیکھ کر اس میں چلے گئے، مدین والوں سے کچھ نہیں فرمایا کہ مسافر ہوں، بھوکا ہوں وغیرہ! بلکہ اللہ کی طرف متوجہ ہو کر فرماتے ہیں: رَبِّ إِنِّي لِمَآ أَنْزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ، اے میرے رب! جو کچھ آپ نے مجھ پر نازل فرمایا ہے میں اس کا محتاج ہوں۔ دیکھو موسیٰ علیہ السلام کو یقین ہے کہ میرے لئے خیر اتر چکا ہے، گو میں دیکھ نہیں رہا ہوں، وہ غیب میں ہے، مگر اے پروردگار اسے اپنے پاس دیکھنا چاہتا ہوں، اسی طرح تم دیکھو کہ بقدر تنخواہ روزی تمہیں دکھائی دے رہی ہے، اور باقی غیب میں ہے، اسے شہود بننے کی دعا کرتے رہو۔

مدرسہ میں صرف مدرس اور معلم بن کر داخل ہو، نہ ملازم اور کاروباری! یہ معلّمی کیا ہے؟ اور معلم کو کیسا ہونا چاہئے؟ اسے میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں، اس کے تقاضوں کو کیونکر پورا کیا جائے، اب میں اپنی آپ بیتی ہٹاتا ہوں اور تمہیں امام غزالی علیہ الرحمہ کی خدمت میں لے چلتا ہوں، انھیں سے سنا جائے، وہ اسرارِ شریعت کے ماہر ہیں، ان کی بات سند ہوگی، انھیں کے ارشادات کی روشنی میں دورِ حاضر کے دینی تعلیمی احوال اور مشکلات کا حل بھی تلاش کیا جائے گا۔

امام غزالیؒ کی مجلسِ احیاء العلوم قائم ہے، وہ اس میں فرما رہے ہیں، پوچھنے والو! سنو: جب آدمی علم حاصل کرتا ہے، تو اس کے چار مرحلے ہیں، جیسا کہ تحصیل مال کے بھی چار مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ کمائی اور تحصیل مال کا ہے، دوسرا مرحلہ مالدار ہوجانے کا، تب وہ دوسروں سے مستغنی ہوجاتا ہے، اسے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑتا، تیسرا مرحلہ اپنے اوپر خرچ کرنے کا ہے، یعنی مال سے فائدہ اٹھانے کا، چوتھا مرحلہ یہ کہ اسے دوسروں پر بھی خرچ کرتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ سخی اور فیاض ہوجاتا ہے، یہ آخری مرحلہ افضل ترین مرتبہ اور مقام ہے۔

یہی حال علم کے باب میں بھی ہے۔ پہلا مرحلہ تحصیل علم کا ہے، جس کا نام طالب

علمی ہے، دوسرا مرحلہ عالم ہونے کا ہے کہ وہ طالب علمی سے فارغ ہو گیا، اس مرحلے میں وہ سوال کرنے سے بے نیاز ہو جاتا ہے، تیسرا مرحلہ غور و تدبر کا ہے کہ وہ اپنے علم سے خود متنفع ہو رہا ہے، چوتھا مرحلہ اپنے علم کو دوسروں تک پہونچانے اور اس کی تعلیم دینے کا ہے، یہ معلّمی اور مدرسی کا مرحلہ ہے، اور یہ اشرف ترین مقام و مرتبہ ہے۔

جس نے علم حاصل کیا، اس پر عمل کیا، اور دوسروں کو تعلیم دی، یہی وہ ہے جس کے بارے میں مَیں پہلے بتا چکا ہوں کہ وہ آسمان کے غیبی عالم میں فرشتوں کے درمیان ''عظیم'' کے لقب سے معروف ہوتا ہے، یہ ارشاد سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہے، یہ شخص سورج کی مانند ہے کہ خود بھی روشن ہے، اور دوسروں کو بھی روشن کرتا ہے، اور مشک کی طرح ہے کہ وہ خود بھی خوشبودار ہوتا ہے، اور دوسروں کو بھی معطر کرتا ہے۔

جو شخص مدرسی اور معلّمی کے منصب پر قائم ہوا، اس نے بہت اہم اور عظیم ذمہ داری سنبھالی، اور بڑا نازک کام اپنے سر لیا، اسے معلّمی کے آداب و وظائف کا بہت اہتمام کرنا چاہئے۔

معلم کے فرائض

دیکھو! امام غزالیؒ فرمارہے ہیں کہ معلم و مدرس کے فرائض اور اس کے وظائف و آداب آٹھ ہیں، ان آٹھوں کا وہ لحاظ رکھے گا تو کامیاب مدرس ہوگا، حق تعالیٰ اسے قبولیت سے نوازیں گے، اس کے شاگردوں کے واسطے سے اس کا فیض عام ہوگا، اور پورے ماحول و معاشرے میں اس کی برکتیں پھیلیں گی۔ تفصیل سنو!

پہلا فریضہ

شفقت ایسی، جیسی اولاد پر ہوتی ہے

سنو! رسول اللہ ﷺ اس امت کے پہلے معلم ہیں، آپ کا ارشاد ہے، فرماتے ہیں:

إنما أنا لكم مثل الوالد لولده (ابوداؤد والنسائی وابن ماجہ وابن حبان من حدیث ابی ہریرۃ) میں تمہارے حق میں ایسا ہی ہوں جیسا باپ اپنے بیٹے کے حق میں ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ اپنی امت کو جہنم کی آگ سے بچانے کی سعی بلیغ کرتے ہیں، والدین اولاد کو دنیا کی آگ سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں، اس سے کہیں بڑھ کر وہ محنت ہے جو آخرت کی آگ سے بچانے کی ہے، اسی لئے استاذ کا حق والدین کے حق سے بڑھ کر ہوتا ہے، والدین دنیوی وجود اور فنا ہو جانے والی زندگی کے سبب ہیں اور استاذ ہمیشہ کی زندگی کا باعث ہے، اگر استاذ و معلم نہ ہوتا، تو والدین کی وجہ سے جو وجود ملا ہے وہ دائمی ہلاکت کے گڈھے میں گرا سکتا ہے، معلم کی وجہ سے اسے دائمی اخروی زندگی ملتی ہے، لیکن اس استاذ سے وہ استاذ مراد ہے جو علوم آخرت اور علوم دین کا معلم ہے، اور وہ بھی آخرت کے قصد وارادے سے، یہ نہیں کہ وہ حصولِ دنیا کی غرض سے علوم آخرت کی معلّمی کر رہا ہو۔ اگر دنیا کی غرض سے وہ علوم دین کی معلّمی کر رہا ہے تب تو وہ خود ہلاک ہو رہا ہے، اور دوسروں کو بھی ہلاک کر رہا ہے۔ (احیاء العلوم، ج:۱، ص:۵۵)

میں چاہتا ہوں کہ یہاں معلم کے پہلے فریضے ''شفقت'' کی قدرے تشریح وتوضیح کردوں، تا کہ بات واضح ہو جائے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ **إنما بعثت معلماً** (ابن ماجہ ودارمی) میں تو بھیجا ہی گیا ہوں معلم بنا کر، اور یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کا طریقہ اور سنت سب کے لئے معیار ہے، پس معلّمی کے اندر بھی آپ ہی کا طریقہ معیار ہے، اب ہمیں دیکھنا ہے کہ معلم کی حیثیت سے آپ کا برتاؤ اپنے تلامذہ کے ساتھ کیسا تھا؟

اس کا جواب اصولی طور پر یہ ہے کہ انسانوں کے ساتھ آپ کے برتاؤ اور سلوک میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں اور روشن ہے، وہ آپ کی شفقت ومہربانی ہے، زندگی کے کسی بھی مرحلہ میں تم رسول اللہ ﷺ کو دیکھو گے، تو آپ کی شفقت اور عنایت کی جلوہ گری ہر جگہ عیاں ہوگی، کہیں سخت گیری کا شائبہ بھی نہ ہوگا، شاگرد کی سہولت، اس کے ساتھ نرمی، اس

کی خیر خواہی، علم سے اس کو معمور کر دینے کا جذبہ اور خیال ہمہ وقت دکھائی دے گا، خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ (سورۂ آل عمران: ۱۵۹) یہ اللہ کی خاص رحمت ہے کہ تم ان کے حق میں نرم مزاج ہو۔ اور دوسری جگہ فرمایا: لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُفٌ رَّحِيْمٌ ○ (سورہ توبہ: ۱۲۸).

تمہارے پاس تمھیں میں سے ایک رسول آیا ہے جس پہ تمہاری تکلیف کی چیزیں گراں ہیں اور تمہارے اوپر وہ بڑا حریص ہے اور مومنین پر وہ بہت مہربان اور رحم و کرم کا مجسمہ ہے۔

اس شفقت و مہربانی کے کچھ جلوے دیکھتے چلو، ایک نوجوان صحابی مالک بن الحویرث ؓ ہیں، وہ مدینہ کے باہر سے حاضر خدمت ہوئے تھے، انھیں کی زبانی واقعہ سنو، فرماتے ہیں کہ:

> ”ہم چند افراد رسول اکرم ﷺ کی خدمت مبارکہ میں حاضر ہوئے، ہم سب ہمسن نوجوان تھے، ہم بیس رات آپ کی خدمت میں رہے، رسول اللہ ﷺ نہایت مہربان اور نرم دل تھے، اس دوران آپ کو خیال ہوا کہ ہمیں اپنے گھروں کا اشتیاق ہو رہا ہے، تو آپ نے ہم سے دریافت فرمایا کہ تمہارے پیچھے کون کون افراد گھر پر ہیں؟ ہم نے بتایا تو آپ نے ازخود فرمایا کہ تم اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ اور وہیں رہو، انھیں یہاں کی باتیں سکھاؤ اور انھیں حکم دو، اور جیسے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے، ایسے ہی نمازیں پڑھو، جب نماز کا وقت ہو، تو ایک آدمی اذان کہے اور تم میں جو بڑا ہے وہ امامت کرے (بخاری و مسلم)

یہ رسول اللہ ﷺ کی شفقت و مہربانی تھی اپنے تلامذہ پر! کہ ازخود ان کے جذبات و خیالات کو محسوس کیا، اور ایک مناسب انداز میں ان کی طبیعت کا عندیہ معلوم کیا، اور پھر مناسب نصیحتوں کی سوغات دے کر رخصت فرمایا۔ تم بھی مدرس ہونے جا رہے ہو، اس بات کو ہمیشہ یاد رکھو۔

ایک اور واقعہ سنو کہ غصہ اور اشتعال کے موقع پر حضرت ﷺ کا رویہ کیسا رہا؟ اور آپ کے تلامذہ نے اس سے کیا اثر لیا۔ ایک صحابی ہیں، حضرت معاویہ بن حکم سلمی ؓ، وہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی اقتداء میں نماز پڑھ رہا تھا، ایک آدمی کو چھینک آئی، میں نے کہا **یرحمک اللہ**، یہ سن کر لوگ مجھے آنکھوں کے اشارے سے تنبیہ کرنے لگے، میں نے کہا کیا بات ہے؟ مجھے کیوں گھور رہے ہو؟ اس پر لوگوں نے ہاتھوں کو اپنی رانوں پر مارا، تب مجھے احساس ہوا کہ یہ لوگ مجھے خاموش کرنا چاہتے ہیں، پھر میں چپ ہو گیا، جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو...... میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، میں نے آپ جیسا بہتر معلم نہیں دیکھا، نہ آپ سے پہلے اور نہ آپ کے بعد...... خدا کی قسم! نہ تو مجھے ڈانٹا، نہ مارا، نہ سخت سست کہا، صرف اتنا فرمایا کہ نماز میں گفتگو کی گنجائش نہیں ہے، یہ صرف تسبیح ہے، تکبیر ہے اور قرآن کی تلاوت ہے! (مسلم شریف: کتاب المساجد)

معلّمی کا معیار یہی ہے کہ طالب علم کا دل بول پڑے کہ میرے استاذ کس قدر شفیق ومہربان ہیں! مہربانی کی یہ خوبصورت یادتا زندگی باقی رہ جائے، اس کے نتیجے میں اچھا تذکرہ باقی رہے، جس کی دعا حضرت ابراہیم ؑ نے کی تھی، **وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ** (الشعراء:۸۴) میرا سچا تذکرہ پچھلوں میں باقی رکھئے۔

ایک طالب علم کی رسول اللہ ﷺ کس درجہ رعایت اور دل جوئی فرماتے ہیں، ذرا اس کا ایک نمونہ دیکھو! حضرت ابورفاعہ عدوی ؓ، حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوئے ہیں، جبکہ آپ خطبہ دے رہے ہیں، انھوں نے پہونچتے ہی کہا کہ یارسول اللہ! ایک پردیسی آدمی آپ کی خدمت میں اپنے دین کے متعلق پوچھنے آیا ہے، اسے نہیں معلوم کہ اس کا دین کیا ہے؟

حضرت خطبہ روک کران کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اور ان کے پاس بنفس نفیس تشریف لاتے ہیں، فوراً آپ کے لئے وہاں ایک کرسی لائی گئی، جس کے پائے غالباً لوہے

کے تھے، اس پر آپ بیٹھ کر انھیں ان باتوں کی تعلیم دینے لگے، جو اللہ نے آپ کو بتائی تھیں، پھر اس سے فارغ ہو کر اپنی جگہ لوٹ گئے اور خطبہ پورا کیا۔ (مسلم شریف)

امام نووی لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ مسلمانوں کے لئے کتنے متواضع اور ان پر کتنے مہربان تھے، واقعی معلم کو سوال کرنے والے کے حق میں ایسا ہی لطف وکرم کرنا چاہئے، اور آپ کا کرسی پر بیٹھنا اس لئے تھا کہ باقی حضرات بھی آپ کا کلام سن سکیں اور آپ کو دیکھ سکیں۔ (شرح النووی)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ معلم، کرسی پر بیٹھ کر تعلیم دے تو درست ہے۔

آپ کی مہربانی اور شفقت کے واقعات بہت ہیں، ان کا احصاء کرنا مقصود نہیں ہے، بس یہ سمجھو کہ طالب علموں کے ساتھ برتاؤ کرنے میں اصلی اور بنیادی چیز نرمی اور شفقت ہے، تمھیں بعض لوگ یہ کہتے ہوئے ملیں گے کہ طلبہ بہت سرکش ہو گئے ہیں ان کے ساتھ سختی کرنی چاہئے، خوب سمجھ لو یہ بات غلط ہے، طلبہ اگر بگڑے ہوئے ہیں، اور تم نے سختی کی اور ظاہر ہے کہ سختی کرنے میں حدودِ شریعت کا لحاظ باقی نہیں رہتا، تو تم بھی بگڑ گئے، جن کی اصلاح کرنے تم چلے تھے، ان کی اصلاح ہوئی یا نہ ہوئی، تم تو بگڑ گئے، اب کون تمہاری اصلاح کرے؟ میں نے بہت دیکھا ہے کہ لوگ طلبہ کی اصلاح کرنے میں خود بہت بگڑ گئے ہیں، گناہگار ہوئے ہیں، اپنی اصلاح، اپنا اخلاق، اپنی دینی حالت مقدم ہے، اور جب تم درست ہو گے تو امید غالب ہے کہ طلبہ کی بڑی تعداد درست رہے گی۔ یہ تصور ہی دل سے نکال دو کہ طلبہ پر سختی کرنی ہے، سختی کرنے کا حکم موقع کے لحاظ سے کفار اور منافقین پر ہے، طلبہ پر نہیں۔

رسول اکرم ﷺ کی وصیت:

حضرت ابوہارون عبدی کہتے ہیں کہ ہم جب کبھی صحابیٔ رسول حضرت ابوسعید

خدریؓ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو وہ فرماتے: **مرحباً بوصية رسول الله ﷺ** (آؤ، تمہیں رسول اللہ ﷺ کی وصیت کی خوشخبری ہو۔ **أن النبي ﷺ قال : إن الناس لكم تبع وإن رجالاً ياتونكم من أقطار الارض يتفقهون في الدين فإذا أتوكم فاستوصوا بهم خيراً** (ترمذی شریف: ابواب العلم) نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ، لوگ تمہارے تابع ہیں، اور لوگ تمہارے پاس ہر طرف سے دین کا علم اور اس کی سمجھ حاصل کرنے کے لئے آئیں گے، تو جب وہ تمہارے پاس آئیں، تو میں تمہیں ان کے ساتھ خیر کی وصیت کرتا ہوں، اسے قبول کرو۔

یہی وجہ ہے کہ حضراتِ صحابہ کے پاس جب کوئی شخص علم کا طالب بن کر آتا، تو وہ اس کا **مرحباً بوصية رسول الله ﷺ** کہہ کر استقبال کیا کرتے تھے۔

پس جن کے بارے میں اللہ کے رسول کی یہ وصیت ہو، اس کے ساتھ کیسا کچھ برتاؤ ہونا چاہیئے؟ جب ایک طالب علم، علم کا طلبگار بن کر مدرسہ میں داخل ہوگیا ہے تو اس سے بدگمان نہ ہونا، کہ وہ یونہی آگیا ہے، نوعمر ہے، ناتجربہ کار ہے، غلطی اس سے ہوگی، مگر اسے دل سے مت گراؤ، بلکہ اسے دل سوزی کے ساتھ نصیحت کرو، اسے اس کے مقصد کی طرف متوجہ کرو، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے قبولیت سے نواز دیں۔

معلم اور مدرس کی ذمہ داری بہت نازک ہے، اور درجہ بھی بہت بلند ہے، مدرس کو کبھی اس فکر سے خالی نہیں ہونا چاہیئے کہ اس کی ذمہ داری ادا ہو رہی ہے یا نہیں؟ اور جو درجہ حق تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے موعود ہے، اس کا اہل وہ بن رہا ہے یا نہیں؟ دیکھو امام غزالیؒ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: **عَلٰی خلفائی رحمة الله ، قيل : ومن خلفاء ک قال: الذين يحيون سنتي ويعلمونها عباد الله** (احیاء العلوم، ج:۱، ص:۱۱) میرے جانشینوں پر اللہ کی رحمت ہو، عرض کیا گیا آپ کے جانشین کون ہیں؟ فرمایا وہ لوگ جو میری سنت کو زندہ رکھتے ہیں اور اللہ کے بندوں کو اس کی تعلیم دیتے

ہیں۔

کیا شبہ ہے کہ ارشادِ نبوت کے مصداق وہی علماء ہیں، جو تدریس اور تعلیم میں لگے ہوئے ہیں، انھیں کی تعلیم سے سنتیں زندہ ہیں، اور یہی طالب علموں کو طریقۂ رسول سکھاتے ہیں۔

پس سب سے پہلے انھیں کو اس کا اہتمام چاہئے کہ تعلیم اور طلبہ کے ساتھ برتاؤ میں نبی ﷺ کے طریقہ کو عمل میں لائیں، تاکہ وہ سنت زندہ رہے۔

ایک واقعہ تمہیں اور بتاتا چلوں، یہ واقعہ صاحب فتح الباری حافظ ابن حجرؒ نے کتاب الزکوٰۃ کے شروع میں طبرانی کی معجم کبیر اور ابن السکن نیز ابو مسلم کجّی کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

مغیرہ بن عبد اللہ یشکری کہتے ہیں کہ میرے والد کوفہ گئے، وہاں مسجد میں داخل ہوئے، تو قبیلہ قیس کے ایک صحابی جنھیں ابن المنتفق کہا جاتا ہے، بیان کر رہے تھے کہ:

> ”مجھ سے رسول اللہ ﷺ کے احوال واوصاف کا تذکرہ کیا گیا، تو میں آپ کی ملاقات کے لئے نکلا، میری آپ سے ملاقات عرفات میں ہوئی، میں ہجوم میں گھستا ہوا آپ کے پاس جانے لگا، تو بعض لوگوں نے مجھے ٹوکا کہ ایک طرف ہٹو، اور آپ کے پاس بھیڑ نہ لگاؤ، آپ نے سنا تو فرمایا، اس آدمی کو آنے دو، اسے کوئی ضرورت معلوم ہوتی ہے، میں پھر بھیڑ میں گھسا اور آپ تک پہونچ گیا، اور میں نے آپ کی اونٹنی کی نکیل پکڑ لی، پھر مجھ پر کوئی نہیں خفا ہوا۔ میں نے کہا دو باتیں مجھے پوچھنی ہیں، ایک تو یہ کہ جہنم سے میری نجات کیونکر ہو؟ دوسرے یہ کہ جنت میں مجھے داخلہ کیونکر ملے؟ آپ نے آسمان کی جانب نگاہ اٹھائی، پھر میری طرف رخِ انور سے توجہ فرمائی، اور فرمایا تم نے سوال تو مختصر سا کیا ہے مگر بہت بڑا اور طویل سوال کیا ہے، اچھی طرح سمجھو۔
>
> اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو، فرض نمازوں کا اہتمام کرو، فرض زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کا روزہ رکھو۔

اس واقعہ کو پڑھو اور دیکھو، طالب علم کے ساتھ حضور کی سنت کیا ہے؟ میرے بیان کی حاجت نہیں ہے، اب پھر چلو! امام غزالی کی خدمت میں، وہ مدرس کا دوسرا فریضہ بیان کر رہے ہیں۔

دوسرا فریضہ

للہ فی اللہ تعلیم دینا

اس کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم دینے میں رسول اللہ ﷺ کی پیروی اس لحاظ سے بھی کرے، کہ تعلیم دے کر اس سے کسی اجرت کا، کسی معاوضہ کا طالب نہ ہو، بلکہ طالب علم سے کسی شکر گزاری کی بھی طلب اور آرزو نہ رکھے، اس کا مقصد صرف قربِ الٰہی اور خوشنودیٔ ربانی ہو، طالب علموں پر اپنا کوئی احسان نہ سمجھے، اگر چہ ان پر احسان تو ہے، لیکن مدرس کو چاہئے کہ اپنے اوپر طلبہ کا احسان سمجھے، کیونکہ انھوں نے اپنے قلوب اور اپنے وجود کو اس کے سامنے پیش کر دیا ہے، تا کہ ان میں علم کا بیج ڈال کر اور علم کی زراعت کر کے، یہ خود اللہ کا قرب حاصل کرے، جیسے کسی نے اپنی زمین کسان کو دے دی، کہ وہ اس میں جوتے بوئے، تو اس سے زمین والے کو جو بھی نفع ہو، مگر کھیتی کرنے والے کو اس سے زیادہ نفع ہوگا، اسی طرح معلم کا نفع متعلم سے زیادہ ہے، اگر طالب علم نہ ہوتا، تو استاذ کو یہ گراں قدر فائدہ کس طرح پہونچتا، جب یہ بات ہے تو تم بجائے کسی اور کے اللہ تعالیٰ ہی سے اجر و ثواب کی امید رکھو، انبیاء علیہم السلام کی ندا ہر ایک کی ایک ہی تھی: **یاقوم لاأسئلکم علیه مالاً إن أجری إلا علی الله**، () اے میری قوم! میں تم سے اپنی اس تبلیغ و تعلیم پر کسی مال کا سوال نہیں کرتا، میرا اجر تو اللہ کے اوپر ہے۔ (احیاء العلوم، ج:۱، ص:)

یہی وہ بات ہے جس کو میں نے کہا ہے کہ تعلیم کو ذریعۂ معاش مت بناؤ۔ مدرسہ میں داخل ہونا دورِ حاضر کے لحاظ سے ''حیلۂ روزی'' ضرور ہے، اور اس سے چارہ بھی نہیں

ہے، لیکن مقصد نہیں ہے، مقصد تو علوم الٰہیہ کی بقاء، اس کی نشر و اشاعت اور جب تک دنیا قائم ہے، اس کا نسلاً بعد نسلٍ منتقل کرتے رہنا ہے، تا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو۔

موجودہ نظامِ مدارس کی تنخواہ اور ٹیوشن کا فرق:

تم سوچو گے کہ قرآن نے انبیاء کا اُسوہ بیان فرمایا کہ وہ قوموں سے کوئی مالی معاوضہ نہیں چاہتے، اور احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ علوم دینیہ کی تعلیم پر معاوضہ لینا درست نہیں ہے، پھر یہ تنخواہ کیا ہے؟

میں نے جہاں تک اس موضوع پر غور کیا ہے، مجھے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ایک ہے خود اپنا طالب علم جس کو وہ پڑھاتا ہے، اس سے اجرت لیتا ہے، جیسے ٹیوشن میں ہوتا ہے، یا طلبہ سے فیس لے کر تنخواہ حاصل کی جائے، چنانچہ بعض دنیاوی مدارس میں دستور ہے۔ قرآن و حدیث میں تعلیم قرآن اور تعلیم دین پر اجرت لینے کی جو ممانعت آئی ہے اس کی یہی صورت معلوم ہوتی ہے، چنانچہ جہاں جہاں ممانعت کا تذکرہ ہے، غور کرو گے تو یہی صورت حال ہوگی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ حکومت اسلامیہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ علوم دینیہ کی تعلیم کا انتظام کرے، حکومت معلمین کو مقرر کرتی ہے، وہ ان کے وظائف متعین کرتی ہے، چنانچہ امیر المومنین سیّدنا عمر فاروق ؓ نے اپنے دور خلافت میں اس کا منظّم شعبہ قائم فرمایا تھا، خاص خاص صحابۂ کرام کو مختلف بلاد و امصار میں تعلیم کے لئے بھیجا تھا، اور بیت المال سے ان کے وظیفے متعین کئے تھے، اپنے عاملوں اور گورنروں کو فرمان جاری کیا تھا کہ قرآن کی تعلیم کے لئے اساتذہ مقرر کریں، اور انھیں وظیفہ دیں، یہ تعلیم قرآن کا معاوضہ نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ جب انھیں ہر کام سے یکسو کر کے خدمت دین میں لگایا گیا، تو ان کی روزی کا کچھ انتظام ضروری ہے، اسلامی حکومت ہے، تو یہ اس کی ذمہ داری ہے، اور حکومت نہیں ہے تو یہ جماعت مسلمین کی ذمہ داری ہے، حکومت نہ ہو تو جماعت مسلمین اس کے قائم مقام ہے،

چنانچہ اقامت جمعہ وعیدین کا مسئلہ، نکاح کے فسخ وتفریق کا مسئلہ وغیرہ جو حکومت کی ذمہ داری ہے، وہ نہ ہو تو جماعت مسلمین اس کی ذمہ دار ہے، اس کی تفصیل حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کی مرتب کرائی ہوئی کتاب ’’ **الحیلۃ الناجزۃ** ‘‘ میں دیکھو۔

تو اب جو صورت حال مدارس کی ہے، وہ حکومت اسلامیہ کی عدم موجودگی میں جماعت مسلمین کی ذمہ داری پوری کررہے ہیں، یہ جو مدرسین کو تنخواہ دے رہے ہیں بظاہر اجرت معلوم ہورہی ہے، لیکن فی الحقیقت اجرت نہیں ہے، بیت المال سے وظیفہ ہے، جو مسلمانوں کے عمومی چندے سے مرتب ہوتا ہے، مدرس جس کو پڑھاتا ہے اس سے کوئی مالی معاوضہ نہیں لیتا، اور نہ مدرسہ ہی ان سے کوئی تعلیمی فیس لیتا ہے۔ اس لئے اس صورت پر ممانعت کا اطلاق نہ ہوگا۔

لیکن اب یہ مدرس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی نیت درست کرے، اسے ذریعۂ معاش نہ قرار دے، جو کچھ مل جائے اسے عطیۂ الٰہی سمجھ کر اللہ کا شکر گزار ہو، اس مسئلہ پر اربابِ انتظام سے کوئی کشمکش نہ کرے، یہ اربابِ انتظام کی ذمہ داری ہے کہ وہ وظیفہ بقدر کفایت مقرر کریں، ہر ایک اپنا فرض ادا کرے تو کسی کو شکایت نہ ہوگی۔

تم مدرسے میں اسی نیت سے داخل ہوؤ کہ جو ملا وہ عطیۂ الٰہی ہے اور جو کم پڑ گیا، اس کا سوال اللہ تعالیٰ سے کرو، تنگی ترشی تو نبی کی میراث ہے، روزی قلیل ہو، نیت درست ہو، زہد وقناعت ہو، اللہ سے راضی ہو، تو اس میں اتنی برکت ہوگی کہ ہر کام آسان ہوگا۔ مسلمان کا کام روپیوں کی گنتی سے نہیں ہوتا، برکت اور خداوندی نصرت سے ہوتا ہے، **كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِإِذْنِ اللهِ،** اذن الٰہی ہو تو تھوڑی سی جماعت، فوجِ گراں پر بھاری پڑتی ہے۔ پس تنخواہ کا گننا چھوڑو، بسم اللہ کرو اور جو کچھ اہل مدرسہ دیں، اسے ان کے ہاتھ سے نہیں اللہ کے ہاتھ سے لو، اور اپنے فرض منصبی میں منہمک رہو، تمہارے اوپر جو طلبہ کی تعلیم وتربیت کا حق ہے، اسے کما حقہ ادا کرنے کی کوشش کرو، اور جس چیز کی کفالت اللہ نے

اپنے اوپر لے رکھی ہے، وہ انھیں کے حوالے رہنے دو، اگر تم نے حق ادا کیا، تو وہ بھی حق ادا کریں گے، وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ، تم میرا عہد پورا کرو، میں تمہارا عہد پورا کروں گا۔ اور اللہ تعالیٰ جب عہد پورا کریں گے، تو اس میں کوئی کسر باقی نہ رہے گی۔

ہاں یہ ہے کہ اپنے طالب علموں سے اپنی کسی منفعت دنیوی کا تصور نہ کرو، نہ تعریف وتوصیف کی، نہ خدمت کی، نہ کسی معاوضہ کی، اگر وہ تمہاری کوئی خدمت کر دیں تو اسے اپنا حق نہ سمجھو، بلکہ ان کا احسان سمجھو، اس کا شکریہ ادا کرو، اس پر انھیں دعائیں دو۔

طالب علموں کی خدمت کا مسئلہ بھی بہت نازک ہے، اس میں بہت احتیاط اور ہوشیاری سے کام لینا، ورنہ جتنا بناؤ گے اس سے کہیں زیادہ بگاڑ دو گے، میں اس مسئلہ کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا، خود سمجھ سکتے ہو، اور تفصیلی جزئیات کے حسن وقبح کا فیصلہ کر سکتے ہو۔

تیسرا فریضہ

طالب علم کی خیر خواہی

امام غزالیؒ فرما رہے ہیں کہ تمہیں طالب علم کی خیر خواہی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرنا چاہئے، جو باتیں اس کے لئے مفید ہیں، انھیں خوب اچھی طرح ان کے ذہنوں میں پیوست کر دینا چاہئے۔ اگر کسی کو دیکھو کہ وہ اپنی تعلیم کو دنیوی اغراض، جاہ ومنصب یا مال ومنال کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنا رہا ہے تو اسے سمجھاؤ۔

امام موصوف کی یہ بات بہت اہم ہے، ہمارے یہاں مدارس کا جو نظام ہے اس میں دار الاقامہ کی بڑی اہمیت ہے، ہر عربی مدرسہ اپنے ساتھ دار الاقامہ رکھتا ہے، طلبہ اس میں ہمہ وقت مقیم ہوتے ہیں، اساتذہ بھی عموماً مدرسہ کی چہار دیواری میں، دار الاقامہ کے اندر ہی رہتے ہیں، یہ انتظام اور موقع طلبہ کے لئے بھی اور اساتذہ کے لئے بھی ایک عمدہ ترین وقت ہے، طلبہ ہر طرف سے یکسو ہیں، مدرسہ کے انتظام میں ان کے سامنے نہ شکم کا

کوئی مسئلہ ہے کہ کھانے سے لے کر ناشتہ تک سب کا انتظام موجود ہے، اور نہ صحت کا کہ بیمار ہوں تو دوا بھی اور ڈاکٹر بھی دستیاب ہوتے ہیں، وہ صرف دینی علوم کے لئے یکسوئی کے ساتھ مستعد اور خالی الذہن ہیں، اساتذہ بھی بیشتر فکر دنیا سے آزاد ہوتے ہیں، اس دینی تعلیم کی برکت سے، بہت سے ایسے مسائل جو اہل دنیا کے لئے دردِ سر بنے رہتے ہیں، ان سے بڑی حد تک یہ بے فکر ہوتے ہیں، ہاں معیارِ زندگی ان کا وہ نہیں ہوتا جو دنیاداروں کا ہوتا ہے، یا جس کے لئے اہل دنیا مرے پڑتے ہیں۔ ایک متوسط معیار پر بحمد اللہ یہ کامیاب ہوتے ہیں، بحمد اللہ کبھی سننے میں نہیں آتا کہ مدرسہ کا مدرس فاقہ کا شکار ہوا ہو، یا اس کے بدن پر کپڑا نہ ہو، یا اس کے رہنے کے لئے بقدر ضرورت سہی! مکان نہ ہو، اس سے زیادہ انھیں کیا چاہئے، یہ تو قرآن وحدیث میں پڑھتے پڑھاتے ہیں کہ دنیا کی زندگی سفر کی ایک گزرگاہ ہے، منزل نہیں ہے، منزل تو آگے جنت ہے، گزرگاہ میں کوئی شخص زیادہ دلچسپی نہیں لیتا، بقدر ضرورت زادِ سفر مل جائے، ضروری سواری مل جائے، بس کافی ہے، جن کا ایمان یہ ہو ان کے لئے ہزار شکر کا مقام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دینی تعلیم میں لگے لپٹے رہنے سے اتنا زیادہ انتظام کر رکھا ہے، جس سے بہت کم پر ہمارے نبی ﷺ اور ان کے اصحاب ؓ اور ان کے بعد کے اسلاف دنیا گزار لے گئے۔

بہر حال مجھے کہنا یہ ہے کہ طلبہ واساتذہ کی یہ ہمہ وقتی رفاقت بہت زیادہ بابرکت ہے، ان حالات میں استاذ اپنے طالب علم کے ذہن ودماغ میں جو بات چاہے پختہ کر سکتا ہے، یہاں ایک استاد کی ذمہ داری ہے کہ وہ طالب علموں کے قلب ودماغ میں وہ تمام باتیں پختہ کر دے، جو علم وعمل اور اخلاق کے محاسن ومعالی ہیں، دنیا کی بے وقعتی، اس کا مقصود نہ ہونا، مال دنیا کا مطلوب نہ ہونا، ان کے دل میں بیٹھا دیا جائے، اچھے اخلاق کی ان کے قلوب میں پرورش کی جائے، اعمال صالحہ کا ذوق ان میں بیدار کیا جائے، یہ وہ بات ہے جو طالب علم کی انتہائی خیر خواہی کی ہے، اگر ان محاسن میں وہ پختہ ہوا، تو مدرسہ کی چہار دیواری سے

دنیائے عمل میں اترے گا، تو کھرا سونا ہوگا، جس کی قیمت کا اندازہ نہیں کیا جا سکے گا۔

تعلیمی خیر خواہی :

خاص تعلیم کے باب میں طالب علم کی خیر خواہی یہ ہے کہ بہت سے تجربوں کے بعد مدرسہ میں درس کے لئے جس جماعت کی جو کتابیں متعین کی گئی ہیں، اور پڑھانے کے لئے ان کی جو مقدار اور جس طرز کا تعین کر دیا گیا ہے، اسے پابندیٔ وقت کے ساتھ مناسب تدریج کے ساتھ پورا کرا دیا جائے، اس اجمال کی شرح یہ ہے کہ:

(۱) استاذ سبق کا کبھی ناغہ نہ کرے، تعلیم کے جتنے دن مدرسہ میں مقرر ہیں، ہر روز ان کے متعینہ اوقات میں کتاب کا سبق آگے بڑھاتا رہے، اور اس میں تدریج رکھے، ابتداء میں جب مناسبت کم ہوتی ہے، تھوڑا تھوڑا سبق پڑھائے، پھر جب مناسبت ہو جائے تو مقدار سبق کی بڑھا دے، اتنی بڑھائے کہ سال کے آخر تک کتاب کا نصاب بآسانی پورا ہو جائے، اس طریقۂ عمل سے نہ طلبہ پر بوجھ زیادہ ہوگا اور نہ کتاب کے سمجھنے میں دقت ہوگی۔

اگر ناغہ ہوتا رہا، خواہ غیر حاضری کی وجہ سے، خواہ مدرسہ میں موجود ہیں اور سبق نہ پڑھایا، خواہ سبق میں طول طویل بے فائدہ، بے مغز تقریروں کی وجہ سے، تو سال کے ایک بڑے حصے میں مقدارِ خواندگی بہت تھوڑی ہوگی، اس سے طلبہ کا نقصانِ حاضر تو یہ ہوگا، کہ بھوک سے کم غذا ملتی رہی اور کمزوری ہوتی رہی، یعنی جب سبق روزانہ نہ ہوگا، یا کم ہوگا تو طلبہ میں بے دلی پیدا ہوگی، محنت کی ضرورت نہ محسوس کریں گے، تو کاہلی بڑھے گی، تو جو کچھ پڑھا ہوگا، وہ اسی وقت کھو چکے ہوں گے، پھر سال کے آخر میں مدرس کو ہوش آئے گا کہ وقت کم ہے اور مقدار زیادہ ہے، تو وہ سبق کی مقدار بڑھائے گا، وقت کی مقدار بڑھائے گا، متعینہ وقت کے علاوہ دوسرے اوقات کو گھیرے گا تو جو مقدار وہ ایک ہفتہ میں پڑھاتا، اسے ایک دن میں پڑھائے گا، تو خود سوچو یہ مقدار طالب علم کو کیونکر ہضم ہوگی، پہلے تو وہ کمی کی وجہ سے سست پڑ گیا تھا، اب زیادتی کی وجہ سے اچاٹ ہو جائے گا، نتیجہ یہ ہوگا کہ بالکل کورا رہ جائے

گا، اس لئے اس کا اہتمام بہت ضروری ہے کہ اسباق میں ناغہ نہ ہو، اور نہ غیر متعلق طول طویل تقریریں ہوں، اور نہ اس کے علاوہ مدرس کے اور دوسرے مشاغل ہوں، مدرسین کا سب سے غلط مشغلہ مجلس بازی کا ہوتا ہے، مجلسی گفتگو میں اتنی لذت اور محویت ہوتی ہے کہ آدمی کو خبر نہیں ہوتی اور وقت برباد ہوجاتا ہے، اس مجلس بازی کی وجہ سے اسباق کا بہت نقصان ہوتا ہے۔

(۲) مدرس کی ذمہ داری ہے کہ اسباق کی تیاری بہت اہتمام سے کرے، کتاب جو زیر درس ہے، اس کا بخوبی مطالعہ کرے، اس کے مشکلات کو اچھی طرح حل کرے اور طلبہ کے سامنے اسے آسان کرکے بیان کرے، بغیر مطالعہ کے ہرگز درسگاہ میں نہ جائے۔ مطالعہ تعلیم کا رُکنِ اعظم ہے، اس سے کبھی غافل نہ ہو، اس سلسلے میں بہت لاپرواہی ہوتی ہے، جس سے طلبہ کا بہت نقصان ہوتا ہے، ان کی استعداد تباہ ہوتی ہے، اور مدرس کی بدنامی اور محرومی الگ ہوتی ہے۔

مدرسین کی ایک مشکل:

تم سوچوگے کہ دورِ حاضر میں دینی اور نیم دینی جلسوں کا رواج بہت ہے، ان جلسوں میں بڑے مدرسوں کے اساتذہ عموماً بلائے جاتے ہیں، متوسط اور چھوٹے مدرسوں میں کوئی باصلاحیت مدرس ہوتا ہے جو تقریر کرسکتا ہے، اسے بھی بکثرت دعوت ملتی ہے، مدرسہ کے باہر اتنے بڑے علماء ملتے نہیں جو اچھا وعظ کہہ سکیں اور عوام ان پر اعتماد کرسکیں، پس لامحالہ مدرسہ کے مدرسین ہی پر نگاہ انتخاب پڑتی ہے، سواریوں کی سہولت کی وجہ سے دور نزدیک سب کا حال یکساں ہوگیا ہے، اس طرح بکثرت مدرسین سفر میں رہتے ہیں، اور سبق کا ناغہ بہت ہوتا ہے بالخصوص بڑے مدرسوں کے بڑے مدرسین اس میں زیادہ مبتلا ہیں، اس سے تعلیم کا بہت نقصان ہوتا ہے، یہ حضرات جب اسفار سے لوٹتے ہیں اور کتاب کی مقدار

خواندگی دیکھتے ہیں، تو سبق کی مقدار اور وقت کی مقدار اتنی بڑھا دیتے کہ پڑھنا نہ پڑھنا سب برابر ہو جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں، ہاں یہ ملت اسلامیہ کا عجیب المیہ ہے، مدرسین کو طلبہ کے لئے یکسو ہونا چاہئے، مگر یہی جلسوں کی بھی زینت ہیں، اور واقعی اس سے تعلیم کا ناقابل تلافی نقصان ہوتا ہے، اس صورت میں طلبہ کا نقصان بھی گوارا نہیں ہوتا، لیکن مدرسین جلسوں میں نہ جائیں یہ پابندی بھی قابل عمل نظر نہیں آتی، اس مشکل کا حل کیا ہے؟

اس سلسلے میں میری ایک تجویز ہے، وہ یہ کہ مدرسین اپنے اسباق کو اولین اہمیت دیں، جہاں اسباق کا نقصان ناقابل تحمل ہو رہا ہو وہاں جانے سے معذرت کر دیں، اور جلسے والوں کو مشورہ دیں کہ اپنے قریبی علماء کو بلا کر وعظ کرا دیں، ان کا نقصان کم ہوگا، سفر میں جو وقت لگتا اس کی بچت ہو جائے گی، گو جلسے والے اس پر راضی نہیں ہوتے، کیونکہ ان کو بڑا نام چاہئے اور مقامی اور قریبی علماء ان کے نزدیک بڑے نام کے نہیں ہوتے، اس لئے میں سوچتا ہوں کہ ان رسمی جلسوں کا ڈھانچہ بدل دیا جائے۔ متعدد علماء پر مشتمل جو جلسے کرائے جاتے ہیں وہ یکسر بند کر دئے جائیں، بہت سے مدرسین کو ہمہ وقت سفر کرنا نہ ہوگا، اور منتظمین بھی بہت ساری زحمتوں سے بچ جائیں گے، اور عوام الناس کو دینی فائدہ بھی زیادہ ہوگا۔

بہر حال! یہ تجویز قبول ہو یا نہ ہو، مدرس کو اپنی ذمہ داری سمجھنی ہوگی، ورنہ وہ خدا کے یہاں جوابدہ ہوگا، اسباق کے نقصان کا بھی اور طلبہ کے دل و دماغ کے ضائع ہونے کا بھی!

خارج اوقات میں سبق:

طلبہ کی خیر خواہی کا ایک اہم شعبہ یہ بھی ہے، کہ اسباق کے لئے مدرسہ نے جو وقت مقرر کیا ہے سبق اسی میں ہو، دوسرے وقت میں نہ ہو، طلبہ کا کوئی وقت خالی نہیں ہے، ایک

وقت درس کا ہے، اور ایک وقت مذاکرے کا، اور مذاکرہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا سبق، تو اگر مدرس خارج میں پڑھائے گا تو یہ خارج مذاکرہ کا وقت ہے، جس وقت میں پڑھاتا تھا اس کو مدرس نے ناغہ کرکے ضائع کیا، اور خارج وقت میں پڑھا کر طلبہ کے مذاکرہ کو ضائع کیا، یہ کہاں کا انصاف ہے؟ پھر ان طلبہ کی استعداد بنے تو کیونکر بنے؟ خارج کے اسباق کا جواز بالکل نہیں ہے۔

چوتھا فریضہ

طلبہ کو غلطی پر تنبیہ مناسب انداز سے کی جائے

میں نے تیسرے فریضہ کی تشریح میں قدرے درازنفسی سے کام لیا، اب پھر چلو مجلس غزالی میں، دیکھو وہ چوتھا فریضہ کیا بتلاتے ہیں۔ سنو فرما رہے ہیں:

> چوتھا فریضہ فن تعلیم کا باریک نکتہ ہے، وہ یہ کہ طلبہ کو کسی غلطی اور اخلاق کی کجی پر تنبیہ کرنی ہو، تو اشارہ کنایہ میں کی جائے۔ اس کی غلطی یا بدخلقی کو کھول کر نہ بیان کیا جائے، نیز انداز تنبیہ مشفقانہ ہو، اس میں محبت و خیر خواہی کی خوشبو بسی ہوئی ہو، بہت سختی اور ڈانٹ ڈپٹ کا انداز نہ ہو، کیونکہ کھل کر تنبیہ کرنے سے ہیبت ختم ہوتی ہے اور خلاف کی جرأت اور اصرار کی لپک بڑھتی ہے، اور لطیف طریقہ پر تنبیہ کرنے سے شریف طبیعتیں اور پاکیزہ نفوس زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ (احیاء العلوم، ج:۱، ص:۵۷)

امام صاحب کی یہ بات بہت قابل توجہ ہے، طلبہ کی بھی عزت نفس ہوتی ہے، ان کی طبیعتیں بھی غیور ہوتی ہیں، وہ ہم سے عمر میں چھوٹے اور علم میں کم ہیں، لیکن ایسا نہیں ہے کہ ان کی طبیعتیں بے حس ہوں، شاگرد ہونے کی وجہ سے وہ ہمارے احترام میں چپ رہ جائیں اور ہماری کڑوی کسیلی کو گوارا کرلے جائیں یہ الگ بات ہے، مگر ان کے احساس کو بھی چوٹ لگتی ہے اور وہ بھی تلملاتے ہیں، اس لئے اگر ان سے کوئی غلطی ہو، تو کڑوے کسیلے الفاظ

، ان کے عیب کا صراحۃً اظہار، اور لہجہ کی سختی نہیں ہونی چاہئے، حتی الامکان کنایہ اور تعریض سے کام لینا بہتر ہے، الفاظ و انداز کی بڑی تاثیر ہوتی ہے۔

میں اس جگہ تمہاری عبرت کے لئے اپنے تین تجربے ذکر کرتا ہوں، دو تجربے دورِ طالب علمی کے ہیں، اس میں مَیں خود اپنے دو بہت ہی محترم استاذوں کی تنبیہ سے مدتوں پریشان ہوتا رہا، اور ایک تدریس کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے، خود میری غلط انداز کی تنبیہ سے ایک طالب علم بہت پریشان ہوا تھا۔ اس سے تمہیں معلوم ہوگا کہ طبیعتوں کی رعایت کتنی ضروری ہے، اور شاید تم کو خود اپنے متعلق بھی کچھ باتیں یاد آجائیں، ان باتوں کو رہنما بنانا چاہئے۔

میں درجۂ عربی سوم کا طالب علم تھا، طالب علمی کے دور میں لاابالی پن کا غلبہ تو ہوتا ہی ہے، پھر میری عمر بھی کم تھی، ایک بزرگ استاد نے ایک سوال جس کا تعلق عام تجربات سے تھا، طلبہ سے کیا، کسی نے کچھ جواب نہ دیا، میری طرف متوجہ ہوکر پوچھا تو میں نے کچھ جواب دیا جو غلط تھا، انھوں نے زجر و توبیخ شروع کی اور اس میں بہت غلو کیا، اور آخر میں ایک ایسی بات کہہ دی جس سے میں کانپ گیا، یہ علم سے محرومی کی بات تھی، مجھے اتنا صدمہ ہوا کہ ہفتوں اسے سوچتا رہا اور رُوتا رہا، دعائیں کرتا رہا۔ اللہ کا فضل ہوا کہ میں ان استاذ سے نہ بدگمان ہوا نہ عقیدت میں کمی آئی، مگر رویا بہت! اب بھی وہ بات یاد آتی ہے تو کانپ جاتا ہوں۔

ایسے ہی ایک بار جب کہ میں درجاتِ نہائی میں تھا، ایک غلطی پر جو غیر معمولی نہ تھی، ایک استاذ نے بہت سخت لہجے میں ڈانٹا، میں نے معذرت کی تو ان کا لہجہ اور سخت ہوگیا، اور اتنی سخت بات کہہ دی کہ میرے دل میں اس کی تلخی بیٹھ گئی۔ اس کے بعد مدتوں یہ حال رہا کہ اگر کھانا کھاتے وقت وہ بات یاد آتی، تو کھانا تلخ ہو جاتا۔

یہ میری طالب علمی کا تجربہ تھا۔ زمانۂ تدریس میں مَیں اپنی درسگاہ میں بیٹھا تھا،

ایک ذہین طالب علم دوسرے طالب علم سے کہہ رہا تھا، میرا کمرہ پہلی منزل پر تھا، وہ طالب علم کمرے سے نیچے، پانی کا نل تھا، وہیں کھڑا دوسرے کو سمجھا رہا تھا کہ، مولانا تم سے ناراض ہیں، تم ان سے جلدی معافی مانگ لو۔ میرے کان میں آواز آئی اور اس کی محبت بھی دل میں محسوس ہوئی کہ وہ دوسرے کے ساتھ خیر خواہی کی بات کر رہا ہے، کچھ دیر اسے سمجھاتا رہا اور آخر میں ایک ایسی بات میرے کان میں آئی کہ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، اس نے کہا کہ ایک مرتبہ مولانا مجھ سے ناراض ہو گئے تھے، اور مجھے ایسی سخت بات کہہ دی تھی کہ میں ایک ہفتہ تک ٹھیک سے کھانا نہ کھا سکا تھا، میں اپنی غلطی کے احساس میں ڈوب گیا، اور سوچنے لگا کہ اپنے استاذ کی ایک بات سے میرا کھانا تلخ ہو گیا تھا، اب میری ایک بات سے میرے ایک طالب علم کا بھی وہی حال ہوا، میں نے اسی وقت اللہ سے معافی مانگی کہ اب ہمیشہ اس کا خیال رکھوں گا، پھر جب کسی کی غلطی پر غصہ آیا اور کچھ کہنا چاہا، تو وہی گفتگو یاد آ گئی، میں نہیں جانتا کہ میں اپنی توبہ میں کامیاب رہا یا نہیں؟ لیکن یہ بات یاد ضرور رہتی ہے۔

بس طلبہ کے احساسات وجذبات کی رعایت کر کے انھیں مناسب انداز میں غلطی پر متنبہ کر دینا چاہئے، سخت زبان استعمال کرنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے، اور اگر کہیں ہے تو بہت کم! نرمیٔ کلام سے درجات بڑھنے کی بشارت حدیث میں ہے، غلطی پر ٹوکا نہ جائے یہ بھی درست نہیں، لیکن لہجہ اور زبان شستہ نہ ہو یہ غلط ہے، بعض لوگوں کی زبان پر گالی کے الفاظ چڑھ جاتے ہیں اور وہ انھیں غصہ میں بے قابو ہو کر بول دیتے ہیں، بعض طلبہ جنھوں نے نہ کبھی گالی دی ہوتی، نہ سنی ہوتی، سن کر نہایت بددل ہوتے ہیں۔ ایک طالب علم مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں فلاں مدرسے میں چند ماہ رہا پھر بھاگ گیا، کیونکہ وہاں ایک صاحب طلبہ کو گالی دے دیتے تھے۔

تالیف قلب کا ہمیشہ دھیان رہنا چاہئے، یہ بہت ضروری مضمون ہے، اسے ذہن ودماغ میں بسا لو۔

پانچواں فریضہ

کسی فن کی اہمیت نہ گھٹائیں

سنو! امام غزالی مدرسین کا پانچواں فریضہ بتاتے ہیں کہ:

> ایک مدرس جو کسی خاص فن کا درس دیتا ہے، اسے چاہئے کہ دوسرے علوم وفنون جو اس کے درس میں نہیں ہیں، طالب علم کے سامنے ان کی اہمیت نہ گھٹائے، مثلاً ادب کا استاذ ہے، اور اس سے اس کو مناسبت ہے، وہ علم فقہ کی شان گھٹائے، یا علم فقہ کا ماہر علم حدیث وتفسیر کی وقعت کم کرے وغیرہ، بلکہ وہ خواہ کسی علم کا ماہر ہو، طالب علم پر ہر علم کی گنجائش کھلی رکھے، اور اگر وہ کئی علم کا صاحب اختصاص ہے تو تدریجاً ایک علم کے بعد دوسرے علم کی طرف متوجہ کرے۔ (احیاء العلوم، ج:۱، ص:۵۷)

امام غزالی علیہ الرحمہ اپنے دور کے حالات کے مطابق یہ فریضہ بتا رہے ہیں، اس دور میں اور اس کے بعد کے اَدوار میں تعلیم کا جو طریقہ تھا وہ یہ کہ الگ الگ فن کے الگ الگ اساتذہ ہوتے تھے، جو اپنے اپنے فن کے طلبہ کو لے کر بساطِ درس بچھائے ہوتے، حدیث کا طالب علم کسی محدث کی خدمت میں حاضر ہوتا، فقہ کا طالب کسی فقیہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتا، علم کلام کا جویا متکلم کے پاس جاتا، منطق وفلسفہ کا چاہنے والا منطقی وفلسفی کا شاگرد بنتا، لغت وادب کا شیدائی لغوی اور ادیب کی جوتیاں سیدھی کرتا۔ انسان کی نفسیاتی کمزوری ہے کہ جس کو جس علم وفن سے دلچسپی ہوتی ہے، دوسرے علم وفن کو وہ قدر ومنزلت نہیں دیتا جس کا وہ مستحق ہوتا ہے، وہ خود بھی اور اس کے طلبہ بھی دوسرے فن کے حق میں انصاف کرنے میں کوتاہی کرنے لگتے ہیں، امام غزالی اس پر متنبہ کرتے ہیں کہ یہ بات طالب علم کی خیرخواہی اور خلوص کے خلاف ہے، مدرس کو خواہ وہ کسی فن کا ہو مدرس ہو، چاہئے کہ وہ دوسرے فن کی

تحقیر نہ کرے، تا کہ ایک طالب علم جب کسی فن میں معتد بہ مہارت پیدا کرلے تو دوسرے ضروری اور مفید فن کی تحصیل میں اسے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

دار العلوم دیوبند کے آغاز سے جس طرز کے مدرسوں کا رواج ہوا ہے، ان میں اکابر نے ایسا انتظام کردیا ہے، کہ تحقیر و تحسین کی یہ کشمکش بہت حد تک کم ہوگئی، کیونکہ علم دین کے لئے ہر ضروری اور معاون فن کو ان حضرات نے درس میں شانہ بشانہ رکھ دیا ہے۔ نحو، صرف، منطق، فقہ، حدیث، تفسیر، بلاغت اور ادب سب تکمیل تک ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں، پڑھانے والے بھی بیک وقت متعدد فنون پڑھاتے ہیں، اس طرح ترجیحات کی گنجائش نہیں نکلتی۔

لیکن اسی طرح کی اس سے زیادہ خطرناک ایک بیماری پیدا ہوتی ہے، جس کے نتائج طالب علم کے حق میں بہت مضر نکلتے ہیں، وہ یہ کہ علوم کی ترجیحات کے بجائے اساتذہ کے درمیان تنافس، بلکہ تحاسد کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے، یہ کیفیت دینی اور اخلاقی اعتبار سے بھی زہر ہے، اور طالب علم اور مدرسہ کے لئے بھی مضر ہے۔

پہلے ہر مدرس کی درسگاہ الگ ہوتی تھی، اب یک ہی مدرسے میں کئی مدرس ہوتے ہیں، یہ مختلف استعداد، مختلف طبیعت ومزاج کے ہوتے ہیں، اور مختلف اساتذہ کے تلامذہ ہوتے ہیں، ایک ہی مدرسہ میں پڑھاتے ہیں، طلبہ کی ہر جماعت متعدد اساتذہ سے پڑھتی ہے، پسند وناپسند کا معیار بھی الگ الگ ہوتا ہے، اس ماحول میں فطرت انسانی کی وہ کمزوری جسے حسد کہا جاتا ہے، بہت زور کرتی ہے، اگر استاذ قلب ودماغ کا کمزور ہوا تو دوسرے پر تنقید وتبصرہ یا شرعی زبان میں غیبت وتنقیص میں مبتلا ہوجاتا ہے، ایک مدرس دوسرے مدرس کو طلبہ کی نگاہ میں اور ماحول کے اندر کم رتبہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس سے طلبہ میں باہم کشمکش پیدا ہوجاتی ہے، پھر تحصیل علم کی سرگرمی ٹھنڈی پڑنے لگتی ہے۔

اس لئے میں تمہیں اس مسئلہ میں بہت تاکید کرتا ہوں کہ ہرگز ہرگز کسی سے حسد نہ

ہو، حاسد جب حسد کرتا ہے تو حق تعالیٰ پر اعتراض کرتا ہے، وہ اللہ سے خوش نہیں ہے کہ فلاں کو علمی تبحر و وسعت، مقبولیت و محبوبیت اور خوش تقریری کی دولت کیوں ملی؟ اس سے سمٹ کر میری طرف کیوں نہیں چلی آتی؟ بھلا بتاؤ، اللہ پر اعتراض کرنے والا کیسے کامیاب ہو سکتا ہے؟ تمہارا طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ جس کسی کی جو خوبی ہو، اسے خوش دلی سے مان لو، اس کا اعتراف کرو اور اس اعتراف کا جو تقاضا ہو، احترام کا، استفادے کا، مدح و توصیف کا، اس میں بخل نہ کرو، جو نعمت اللہ نے اسے دی ہے تم اس پر راضی ہو، تو اللہ سے راضی ہو، ہرگز ہرگز اس کی تنقیص نہ کرو، نہ صراحۃً نہ کنایۃً، نہ طلبہ کے سامنے نہ اپنے ہم چشموں اور معاصرین کے درمیان! غیبت جیسی کچھ معصیت ہے تم جانتے ہو، پھر آدمی جب غیبت کرتا ہے تو غیبت ہی تک محدود نہیں رہتا، وہ اس کی حد سے گزر کر تہمت اور بہتان کی مہلک اور اندھیری وادی میں جا گرتا ہے، پھر وہ اللہ کے یہاں بھی ذلیل و خوار ہوتا ہے، اور مخلوق بھی اس سے بیزار ہو جاتی ہے۔

فی زمانہ مدارس میں بعض اوقات مدرسوں کی مجلسیں غیبت، بہتان، استہزاء و تحقیر کی غلاظتوں کا انبار بن جاتی ہیں، ان سخت معاصی میں مبتلا ہو کر بھی عالم کے عالم اور بزرگ کے بزرگ بنے رہتے ہیں، معصیت سے بچنا بہت ضروری ہے، اور یہ حقوق العباد قسم کی معصیتیں انسان کے قلب و دماغ کے لئے سخت مضر ہیں اور مرنے کے بعد تو خطرۂ عظیم ہیں، اس لئے مدرسے میں قدم رکھو تو اپنے ہی جیسے یا اپنے سے بڑے علماء کا گوشت نہ کھاؤ۔ اس سے اس طرح بچو جیسے آدمی سانپ سے بچتا ہے، یہ موضوع بہت ضروری ہے، اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو اس پر بہت کچھ لکھتا، لیکن تم تو خود واقف ہو، عاقل کو اشارہ کافی ہے۔

چھٹا فریضہ

طالب علم کو اس کی عقل و فہم کے معیار پر تعلیم دینا

امام غزالی ارشاد فرماتے ہیں کہ:

> طالب علم کو اس کی عقل وفہم کے لحاظ سے علوم کی تعلیم دینا چاہئے ، اسے وہ علم اور وہ بات سکھانے کے درپے نہ ہو، جس تک اس کی عقل وفہم کی رسائی نہ ہو، ورنہ یا تو علم ہی سے متنفر ہو جائے گا، یا خبط میں پڑے گا، نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہم انبیاء کی جماعت کو پابند کیا گیا ہے، کہ لوگوں کو ان کے مرتبے پر رکھیں، اور ان سے ان کی عقل ودرایت کے لحاظ سے بات کریں، اور حضرت ﷺ نے فرمایا، جب کوئی شخص لوگوں کی رسائی عقل سے ورے بات کرتا ہے تو یہ باان میں بعض کے لئے فتنہ بن جاتی ہے۔ (احیاء العلوم، ج:۱، ص:۵۷)

یہ بات بہت واضح ہے، کہ آدمی کے عقل وفہم سے بلند اور غامض بات کا اسے مخاطب بنایا جائے ، تو وہ اس کے لئے ایک آزمائش ہوتی ہے، لیکن اب مدرسوں کا جو نظام اجتماعی ہے، اس میں اس فریضہ کی رعایت خاصی دشوار ہے، ایک جماعت میں متعدد طلبہ ہوتے ہیں، اور ہر ایک کی عقل وفہم کا پیمانہ الگ ہوتا ہے، ایک طالب علم کتاب کا مقصد پالیتا ہے، دوسرا بہت کوشش کرتا ہے، تب بھی اس کی رسائی نہیں ہوتی، اس طرح بغیر سمجھے ہوئے اس کا سبق آگے بڑھتا رہتا ہے، روز بروز علم کا وزن اس پر بڑھ رہا ہے، اور وہ ہے کہ اس سے بالکل بے بہرہ ہے، جماعتی درس کا نظام ایسا ہے کہ خواہ وہ کچھ سمجھے یا نہ سمجھے، اس کی ترقی ہوتی رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ بغیر فہم وادراک کے فارغ التحصیل بن کر سند لے کر مدرسے کے باہر آجاتا ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ عالم ہے، اور وہ خود بھی اپنے کو عالم کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، حالانکہ وہ علم سے خالی ہے۔

موجودہ تعلیمی نظام میں اس کا حل دشوار ہے، اس صورت حال میں مدرس کیا کرے، وہ خود اکتا جاتا ہے، اور پڑھانے کے لئے جو ضروری محنت ہونا چاہئے اس میں کوتاہی کرنے لگتا ہے۔ اس جماعتی نظام میں سب کو باندھ کر لے چلنے میں سب کی استعدادیں متاثر ہوتی ہیں، ذہین طلبہ اپنے ذہن کے مناسب خوراک نہیں پاتے ، کیونکہ

کمزوروں کو لے کر چلنا ہوتا ہے، اور کمزور طلبہ کو ذہینوں کے ساتھ اپنی طبعی رفتار سے تیز دوڑنا پڑتا ہے، تو وہ پچھلے سے محروم ہوتے جاتے ہیں، اور اگلا ہاتھ نہیں لگتا، استاذ بھی اس ذہین وغبی کی کشمکش میں سست ہوجاتا ہے۔

تاہم اس نظام میں بھی کچھ نہ کچھ ایسے نکل آتے ہیں، جن سے علم اور دین کی آبرو باقی رہتی ہے، اس صورت حال میں مدرس کا خلوص، اس کی محنت، دین کو زندہ کرنے کی لگن اور علوم دین کے احیاء وابقاء کی دھن زیادہ موثر ہوتی ہے، استاذ کو ان امور کا جتنا اہتمام ہوگا طالب علم اس سے متاثر ہوگا۔ بہرحال مدرس کو اپنی جیسی محنت کرلینی ہے، اللہ تعالیٰ کا دین باقی رہے گا، اور یہ محنتیں اور تدبیریں موثر رہیں گی۔ ان شاءاللہ تعالیٰ

ساتواں فریضہ

مدرس خود صاحب عمل ہو

امام غزالی علیہ الرحمہ نے ساتویں فریضہ کے عنوان سے جو کچھ بیان کیا ہے، وہ چھٹے ہی سے تعلق رکھتا ہے، اسے میں بقدر ضرورت لکھ چکا ہوں، اس کے بعد جسے انھوں نے آٹھویں فریضہ کا عنوان دیا ہے، اسے میں ساتویں فریضے کے عنوان سے لکھتا ہوں، فرماتے ہیں کہ:

> مدرس کو اپنے علم پر باعمل ہونا چاہئے، اس کا فعل اس کے قول کی تکذیب نہ کرے، کیونکہ علم کا ادراک بصیرت سے ہوتا ہے، اور عمل کا پتہ بصارت سے چلتا ہے، اور بصیرت والے کم ہیں، بصارت والے زیادہ ہیں، پس جب اس کا عمل اس کے علم کے خلاف ہوگا، تو ہدایت کا دروازہ بند ہوجائے گا، دیکھو اگر کوئی شخص کسی چیز کو خود کھا رہا ہے اور لوگوں کو منع کررہا ہے کہ مت کھاؤ، کیونکہ یہ زہر قاتل ہے، تو لوگ اس کی ہنسی اڑائیں گے، اسے متہم کریں گے، اور جس چیز سے انھیں منع کیا جاتا ہے اس کی حرص اور زیادہ بڑھ جائے گی، اور لوگ کہیں کہ اگر یہ چیز

عمدہ اور لذیذ نہ ہوتی تو یہ دوسروں کو روک کر خود کیوں کھاتا؟

استاذ کی مثال شاگرد کے حق میں ایسی ہے جیسے ٹھپہ، گیلی مٹی کے حق میں، اور جیسے لکڑی سایہ کے حق میں، خود سوچو اگر ٹھپہ نقش و تحریر سے خالی ہوگا تو گیلی مٹی پر کوئی نقش کیسے ابھرے گا، اور لکڑی ٹیڑھی ہوگی تو سایہ سیدھا کیونکر ہوگا۔ کسی کا شعر ہے ؎

لاتنه عن خلق وتاتی مثله عار علیک إذا فعلت
عظیم

جب خود کسی چیز کے عادی ہو، تو لوگوں کو اس سے منع نہ کرو، کیونکہ جب تم خود اسے کر رہے ہو تو تمہارے لئے بہت شرم و ننگ کی بات ہوگی۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اَ تَـأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (سورۃ البقرۃ:) کیا تم دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ اسی لئے عالم کی معصیت، جاہل کی معصیت سے زیادہ مستحق سزا ہوتی ہے، کیونکہ عالم کی غلطی سے بہت سے لوگ بھٹک جائیں گے، اور جس نے کوئی برا طریقہ رواج دیا، اس پر اس کا اپنا گناہ تو ہے ہی، جو اس پر عمل کرے گا اس کا بھی گناہ ہوگا، اسی لئے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ دو آدمیوں نے میری کمر توڑ دی، بے عمل عالم نے، اور جاہل عبادت گزار نے، جاہل اپنی عبادت سے لوگوں کو دھوکہ دیتا ہے، اور عالم اپنی بے عملی کی وجہ سے! (احیاء العلوم، ج:۱، ص:۵۸)

یہ آخری فریضہ اور وظیفہ ہر مدرس کے پیش نظر ہمہ دم رہنا چاہئے۔ مدرس ایک عالم اور رہنما ہوتا ہے، اولاً اس سے اس کے تلامذہ اور طلبہ علم و عمل کا اکتساب کرتے ہیں، ثانیاً دوسرے لوگوں میں اس کے علم و عمل کا پیغام جاتا ہے، عالم اگر علم کے ساتھ عمل کا پیکر نہ ہو، اس کا علم کچھ اور ہو، اور اس کا عمل کچھ اور ہو، تو یہی صفت اس کے شاگردوں میں سرایت کرے گی، اس طرح نام کے علماء تو بکثرت ہوں گے، مگر حقیقۃً عالم جن کے عالم ہونے کی

تصدیق اللہ تعالیٰ بھی کریں، ناپید ہوجائیں گے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ** ، اللہ کے بندوں میں، اللہ کی خشیت رکھنے والے علماء ہی ہوتے ہیں، جس عالم کے دل میں اللہ کی خشیت واقعی ہوگی وہ عمل میں پیچھے نہ ہوگا۔

امام ابوبکر محمد بن حسین آجری متوفی ۳۶۰ھ اپنے بیش قیمت رسالہ ”اخلاق العلماء“ میں عالم باعمل، صاحب خوف وخشیت کا حال اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

> وہ خدا تعالیٰ کا شاکر وذاکر ہوتا ہے، محبت خداوندی کی حلاوت سے سرشار، مناجاتِ الٰہی میں فارغ ویکسو، تمامتر طاعت وعبادت کے باوجود اپنے آپ کو گنہگار وخطا کار شمار کرتا اور حسن عمل پر دوام کے باوجود خود کو پُرتقصیر سمجھتا ہے، خدا کی پناہ اس نے ڈھونڈھی، خدا نے اسے قوت بخشی، خدا پر اعتماد وتوکل کیا پھر کسی کا خوف دل میں نہیں لایا، اللہ کو پاکر ہر چیز سے بے نیاز ہوگیا، ہر چیز میں خدا ہی کا محتاج رہا، اس کو اُنس ہے تو محض اللہ سے، اور وحشت ہر اس چیز سے ہے جو خدا سے اسے ہٹادے، اس کا علم بڑھتا ہے تو خدا کی حجت پختہ ہونے سے خائف ہوتا ہے، سابقہ اعمال صالحہ کے سلسلے میں عدمِ قبولیت سے ڈرتا رہتا ہے، تلاوت کلام اللہ کرتے وقت اس کی فکر رہتی ہے کہ اپنے مولیٰ کی بات سمجھ لوں اور سنت رسول میں اشتغال اس لئے ہوتا ہے کہ اس میں تفقہ حاصل کرلے، مبادا کوئی حکم ضائع نہ ہوجائے، قرآن وسنت کے آداب سے مزین ہوتا ہے، اہل دنیا سے دنیاوی عزت کے سلسلے میں کوئی مسابقت نہیں کرتا اور دنیاوی ذلت سے اسے کچھ گھبراہٹ نہیں ہوتی، زمین پر تواضع، وقار اور سکون کے ساتھ چلتا ہے، اس کا دل ہر وقت عبرت پذیری میں مشغول رہتا ہے، اگر کبھی اس کا دل اللہ کی یاد سے خالی ہوجائے تو اس کے نزدیک سخت مصیبت ہے، اگر اللہ کی اطاعت بغیر حضور قلب کے ہو تو سخت محرومی اور خسارہ، ذاکروں کے ساتھ ذاکر، غافلوں کی حالت سے عبرت پذیر، اپنے عیوبِ نفس سے واقف اور اسے مُتَّہم جاننے والا، علوم میں اتنی

وسعت کہ سمجھ بالکل کھلی ہوئی، جس کا اثر یہ ہے کہ ذاتِ حی وقیوم سے حیا وشرم اس کے دل میں سما گئی، تمام اعمال میں مشغولی بحق مسلسل اور ماسوا اللہ سے انقطاع ویکسوئی مکمل!

اس اقتباس کو بار بار پڑھو اور دیکھو کہ تمہارے اندر ان میں سے کتنے اوصاف ہیں، دھوکہ مت کھانا، نفس کے فریب میں مت آنا، اگر کوئی صفت موجود ہو، تو دل وجان سے اللہ کا شکر ادا کرو، ورنہ استغفار کرو، اپنے اندر ان صفاتِ حمیدہ کے پیدا کرنے کی محنت اور ہمت کرو۔

یہ بات ہمیشہ یاد رکھو کہ تم صرف مدرسہ کے ملازم اور مدرس نہیں ہو، ملازمت کا تصور جن تقاضوں کو پیدا کرتا ہے، وہ تو بہت تھوڑے ہیں اور ذرا سی توجہ سے وہ حل ہوجاتے ہیں، لیکن تمہاری جو اصل حیثیت ہے وہ عالم ہونے کی ہے، اور تم کو عالم ربانی ہونا ہے، اس لئے اگر اس پر دھیان دوگے تو عزت ہی عزت ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی!

☆☆☆☆☆

مدرس بحیثیت کارکن مدرسہ

فرزند عزیز! ایک عالم اور مدرس کو طالب علم کے ساتھ کیسا ہونا چاہئے، اس کی تفصیل بقدر ضرورت میں نے لکھ دی ہے، تمہارا اصل کام یہی ہے، اس کام کو جتنے خلوص، لگن، دیانت داری اور شفقت ومحبت کے ساتھ انجام دوگے، اسی کے بقدر ملکوت میں ''عظیم'' کہلانے کے مستحق ہوگے۔

لیکن اس اصل کام کے انتظام میں دائیں بائیں کچھ علائق وروابط ہیں، جن سے مدرسہ کے موجودہ نظام میں گزرنا، ناگزیر ہوتا ہے، اس کے متعلق کچھ کارآمد باتیں لکھتا ہوں، انھیں بغور پڑھو!

ملازمت

مدرسہ میں جب تم کارِ تدریس کے لئے داخل ہونا چاہو گے، تو سابقہ مدرسے کے انتظام سے ہوگا، یہ انتظام مدارس میں رائج عام دستور العمل کے تحت ہوتا ہے، اور اس انتظام کو نافذ کرنے والا مدرسہ کا مہتمم یا ناظم ہوتا ہے، دستور کے مطابق تمہارا ایک معاہدہ ہوگا۔

(۱) تمہیں کیا پڑھانا ہے؟
(۲) تعلیم کا دستوری وقت کیا ہے؟
(۳) دورانِ تعلیم وقفے کیا کیا ہیں؟ اور کتنے ہیں؟
(۴) تنخواہ کیا ہوگی، اور اس کی کمی بیشی کے قواعد کیا ہوں گے؟

جب یہ اور اس طرح کی باتیں طے ہو جاتی ہیں، تو تمہارا عمل اس مدرسہ میں جاری ہو جاتا ہے، اس ساری کارروائی کے لئے تمہارا واسطہ ناظم مدرسہ سے پڑتا ہے، اس موقع پر تم کو کس طرح ناظم سے اور اہل انتظام سے معاملہ کرنا چاہئے، میں تمہیں بتاتا ہوں۔

اوپر میں نے جو چار دفعات لکھے ہیں، انھیں دو حصوں میں کر کے گفتگو کرتا ہوں، پہلے حصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ تمہیں اپنے آپ کو کس طرح پیش کرنا ہے، دوسرا حصہ تنخواہ اور معاش سے متعلق ہے۔

میں بڑی دیر سے سوچ رہا ہوں کہ یہ بات تمہیں کیونکر سمجھاؤں، ملا کی دوڑ مسجد تک، مومن کی دوڑ پیغمبر تک! اس بات کو سمجھنے کے لئے میں حضور نبی کریم فداہ روحی ﷺ کی خدمت میں حاضری دے رہا ہوں، اور تم کو بھی اسی پاک بارگاہ میں لے کر چلتا ہوں۔ ایک مومن کو کیا ہونا چاہئے، اجتماعی معاشرہ میں اس کی صفت کیا ہونی چاہئے اسے آپ کے ارشادات کی روشنی میں دیکھو، حضرت ابو ہریرہ ؓ فرمانِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نقل کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: **المومن هين لين حتیٰ تخاله أحمق (شعب الایمان للبیهقی)** مومن

متواضع اور نرم ہوتا ہے، اتنا نرم ہوتا ہے کہ تمہیں خیال ہونے لگے کہ یہ بیوقوف ہے۔ ایک دوسرے حدیث سنو! **المومنون هينون لينون كالجمل الانف ، ان قيد انقاد وإذا انيخ علىٰ صخرةٍ استناخ** (کتاب الزہد لابن مبارک) اہل ایمان سادہ متواضع اور نرم مزاج ہوتے ہیں، جیسے نکیل کی وجہ سے زخمی نتھنوں والا اونٹ کہ اگر اسے لیجایا جائے تو چلنے لگتا ہے، اور اگر کسی چٹان پر بیٹھایا جائے تو بیٹھ جاتا ہے۔

ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن سادہ طبیعت، متواضع اور نرم مزاج ہوتا ہے، اس کے مزاج کی نرمی اس حد تک ہوتی ہے، کہ لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ اصل بات کی تہ تک نہیں پہونچ پاتا، بہت بھولا بھالا ہے، حالانکہ یہ بات نہیں، وہ سمجھدار ہوتا ہے، مگر طبعی شرافت اور نرمی کی وجہ سے ناگوار باتوں کو اس طرح درگزر کرتا ہے جیسے سمجھا ہی نہیں، سوچو کہ رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر دانا اور ذہین وفطین کون ہوسکتا ہے، لیکن رحمتِ الٰہی کا اثر یہ تھا کہ آپ مزاج کے نہایت نرم تھے، **فبما رحمةٍ من الله لنت لهم**، اس نرمی اور شرافت طبعی کا اثر یہ تھا کہ جو کوئی منافق آپ کی خدمت میں آکر کوئی جھوٹ موٹ بھی کوئی عذر پیش کرتا تھا، تو اسے سنتے تھے اور قبول کر لیتے تھے، یہ آپ کی مہربانی اور نرمی تھی، مگر **يقولون هو أذن** منافقین کہنے لگے تھے کہ آپ تو صرف کان ہیں، جو کہا سن لیا، سمجھتے بوجھتے کچھ نہیں، حالانکہ آپ سب کچھ سمجھتے تھے، مگر آپ کی ذہانت وذکاوت، آپ کی نرمی ومہربانی کے سامنے ماند پڑی رہتی تھی۔

تم نے دیکھا رسول علیہ السلام نے جس صفت کو مومن کی شناخت قرار دیا ہے، وہ صفت آپ کے اندر بدرجۂ کمال تھی، یہ صفت اللہ کو محبوب ہے، اللہ کے رسول کو محبوب ہے، ذہانت کی تیزی اور ذکاوت کی حدت نہ اللہ کو پسند ہے اور نہ رسول کو! علامہ سیّد سلیمان ندوی علیہ الرحمہ نے سیرۃ النبی کی ساتویں جلد میں لکھا ہے، بہت عرصہ ہوا پڑھا تھا کہ امیر المومنین حضرت عمر فاروق ؓ نے زیاد کو کہیں کا عامل (حاکم) بنایا تھا، پھر کچھ دنوں کے بعد معزول

کر دیا، حضرت عمر کا معزول کرنا یا تو کمزوری کی بنا پر ہوتا تھا کہ یہ حاکم مظلوموں کو انصاف اور اصحاب حق کو ان کا حق نہیں دلا سکے گا، یا خیانت کی وجہ سے ہوتا تھا کہ جب حاکم ہی خائن ہوگا تو حکومت کا اللہ حافظ!

زیاد نے بہت غور کیا، مگر اپنے اندر ان دونوں خرابیوں میں کوئی خرابی محسوس نہیں ہوئی، انھوں نے جرأت کی اور امیر المؤمنین سے پوچھ لیا کہ کس امر کے باعث انھوں نے معزول فرمایا ہے، تاکہ اس عیب کی اصلاح ہو سکے، امیر المؤمنین نے فرمایا کہ نہ کمزوری اور نہ خیانت! لیکن بات یہ ہے کہ تم بہت ذہین ہو، میں نہیں چاہتا کہ تمہاری عقل و ذہانت کا بار امت پر پڑے۔

یہ وہ ذہانت تھی جو نرمی مزاج سے معتدل نہیں ہوئی تھی، پھر ذہانت کے جو آثار ہوتے ہیں وہ واقعی عام آدمی کے لئے ناقابل برداشت ہوتے ہیں۔

پس جب تم مدرسہ میں انتظام کے ماتحت پابند کارگزار ہو رہے ہو، تو تمہارے مزاج کی نرمی تمہاری ذہانت کی تیزی پر غالب رہنی چاہئے، ناظم مدرسہ کے ساتھ تمہارا معاملہ، تمہاری بات چیت نرم اور متواضع ہونی چاہئے، جس سے معروف میں اطاعت بخوشی اطاعت جھلکے، یہ رویہ ہرگز نہ ہو کہ صاحب انتظام کوئی بات کہے، اور تم اپنی ذہانت و ذکاوت کے بل پر اس کے کمزور پہلوؤں کو موضوع کلام بنالو، یا اس میں موشگافیاں کرنے لگو، ہر صاحب انتظام اپنے انتظام میں ایسے شخص کو پسند کرتا ہے جس میں اعتراض و انشقاق سے زیادہ انقیاد و اطاعت کا جذبہ دیکھتا ہے، تمہیں دین کا کام کرنا ہے، اس کے لئے جس انتظام کے ماتحت تم داخل ہوئے ہو، حتی الامکان اس کی موافقت کرو، تاکہ تمہاری خدمت آرام سے چلتی رہے، جب تک حرام صریح کا حکم نہ ملے اطاعت ہی ضروری ہے، مناسب یا نامناسب، رائے کے اختلاف سے تعلق رکھتا ہے، ہوسکتا ہے کہ تمہاری رائے صاحب انتظام کی رائے کے موافق نہ ہو، اپنی رائے اس پر تھوپنے سے آسان یہ ہے کہ تم اس کی رائے قبول

کرلو اس سے کام میں الجھن نہ ہوگی، اور اگر الجھن ہوگی تو اس کا حل آسان ہوگا۔ نئے مدرسین اس طرح کے مواقع پر حق گوئی کا نام دے کر اپنی رائے بے ڈھنگے پن سے پیش کرنے کو شجاعت اور بے خوفی سمجھتے ہیں، حالانکہ کیا ضروری ہے، جو بات اس تازہ ناتجربہ کار مدرس نے سوچی ہے وہ حق ہی ہو؟ کل کو خود اسی کی رائے بدل سکتی ہے، اس لئے رائے کے اظہار و اصرار میں جلدی نہ کرنی چاہئے، اپنی تعلیمی زندگی میں مَیں نے ایسا بہت دیکھا ہے کہ مدرس کو انتظامیہ کی جس بات پر انکار و اعتراض ہوتا ہے، اگر کبھی وہ خود اسی ذمہ داری میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کا بھی طرز عمل وہی ہوتا ہے جس پر پہلے اعتراض کرتا تھا۔

انتظامیہ سے موافقت اور عدم منازعت کے باب میں ایک مشہور حدیث ہمیشہ یاد رکھو۔

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسا وعظ فرمایا کہ آنکھیں آنسوؤں سے ابل پڑیں، اور قلوب دہل گئے، ہم نے عرض کی یا رسول اللہ! یہ تو ایسی باتیں آپ نے ارشاد فرمائی ہیں، جیسے کوئی رخصت ہونے کے وقت نصیحت کرتا ہے، تو حضرت! ہمیں آپ کس چیز کی تاکید فرماتے ہیں؟ فرمایا:

(١) میں تمہیں ایسی روشن شریعت پر چھوڑ کر جاؤں گا، جس کی رات بھی اسی طرح روشن ہے جیسے دن! میرے اس طریق سے وہی انحراف کرے گا جو برباد اور خائب و خاسر ہوگا۔

(٢) جو کوئی تم میں سے زندہ رہے گا وہ بہت سے اختلافات دیکھے گا، تو تم میری سنت اور اصحاب ہدایت خلفاء راشدین کی سنت جسے تم جانتے پہچانتے ہو، اسی کو لازم پکڑو۔

(٣) اطاعت و فرمانبرداری کو اپنے اوپر لازم کرلو، اگرچہ تمہارا صاحب امر حبشی غلام ہو، اس بات کو تم دانتوں سے مضبوطی سے پکڑلو، مومن کی مثال نکیل سے زخمی نتھنے والے اونٹ کی سی ہے، جہاں اسے لے جایا جاتا ہے چلا جاتا ہے۔ (ترمذی، احمد، ابن ماجہ)

اس حدیث کا ہر مضمون ایک شمع ہدایت ہے، مومن اس شمع کو اپنے ہاتھ میں رکھے تو

کبھی غلط راہ پر نہ جائے گا، مگر میں جو کچھ تم سے کہنا چاہتا ہوں، وہ اس کا آخری حصہ ہے، جس کو میں نے نمبر ۳ کے عنوان سے لکھا ہے، امیر اور حاکم صاحب انتظام ہوتا ہے، خواہ وہ ملک کا حاکم ہو، خواہ کسی چھوٹے ادارے کا منتظم ہو، حتیٰ کہ سفر میں بھی جب چند رفقاء ہوں، تو ایک کو امیر منتخب کرلینے کا حکم ہے، پھر سب اس کی اطاعت کریں، اسی طرح مدرسہ بھی ایک ادارہ ہے، اس میں متعدد شعبے ہوتے ہیں، ان سب کی خدمات تعلیم علم دین ہی کے محور پر ہوتی ہیں، ان سب کا جو منتظم ہو اس کی اطاعت اور موافقت کرنا، ان سب کے لئے ضروری ہے جو اس نظام سے وابستہ ہیں، اسی بنیاد پر کہتا ہوں کہ مدرسین اگرچہ علماء ہیں، علم، بزرگی اور عمل کے اعتبار سے گو ان کا مرتبہ بلند ہو، مگر صاحب انتظام کی اطاعت ضروری ہے ورنہ اصل کام میں خلل ہوگا۔

ہمارے مدرسوں میں یہ کمی دیکھنے کو ملتی ہے کہ مدرسین انتظامیہ کو تنقید و اعتراض کا نشانہ بنائے رہتے ہیں، اور صاحب انتظام بھی مدرسین سے کھنچا کھنچا بدگمان سا رہتا ہے، دونوں طرف یہ غلطی ہے، اہل تدریس نظام مدرسہ میں خود کو اپنے کارہائے مفوضہ کا پابند بنائیں، انتظام کو انتظامیہ پر چھوڑ دیں، جذبۂ اطاعت کے ساتھ، خوش دلی سے کام پورا کرتے رہیں، اہل انتظام کی مدد کریں، جن باتوں میں ان کی رائے اہل انتظام سے متفق نہ ہو، وہاں بھی اطاعت انھیں کی کریں اور انھیں تنقید و اعتراض کا نشانہ نہ بنائیں۔

مدرسین جب انتظامیہ پر تنقید و اعتراض کرنے لگتے ہیں، تو ان کی مجلسیں بدگمانی، غیبت بلکہ تہمت تک میں مبتلا ہوجاتی ہیں، اور وہ مسلسل گناہ میں ملوث ہوتے رہتے ہیں، اور ان کی صحبت میں رہنے والے طلبہ بھی اس سے متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ اہل تدریس پورے جوش اور لگن سے کارِ تدریس میں لگے رہیں اور انتظام میں دخل نہ دیں، تو تعلیم کا کام خوب ہوتا رہتا ہے، انتظام کی شکایت کرنے کے بجائے اگر کچھ تکلیف اور دقت ہوتی ہے تو اس کا تحمل کریں، اور تعلیم جو بڑی عبادت ہے اس میں مشغول رہیں، مشکلات کا

حل تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا جو ارشاد ہے کہ **تؤدون الحق الذی علیکم وتسألون اللہ الذی لکم** (بخاری: علامات النبوۃ/مسلم: مغازی) پر عمل کریں، یعنی ان پر جو مدرسہ، تدریس اور انتظام کا حق ہے، اسے بحسن وخوبی ادا کریں، اور ان کا جو حق اہل انتظام پر ہے، اس کا سوال اللہ سے کریں۔

علامہ عبدالروف مناویؒ دلیل الفالحین شرح ریاض الصالحین میں لکھتے ہیں کہ:

> ''وہ حق جو تم پر ہے، یعنی اطاعت کرنا اور نافرمانی اور بغاوت نہ کرنا، اسے تم کرو، اور جو ان پر تمہارا حق ہے، اس کا سوال اللہ سے کرو، وہ ان کے قلوب کو تمہارے حق کی ادائیگی کے لئے مسخر کرے گا، یا تم کو اس کے عوض میں کچھ اور بہتر چیز عطا فرمائے گا، یہ حکام اگر تمہارا حق واجبی ادا نہیں کرتے، تو اس کی وجہ سے ان کے خلاف نافرمانی اور بغاوت جائز نہیں ہے۔''

آگے لکھتے ہیں:

> ''اس حدیث سے مقدر پر صبر، فیصلۂ الٰہی پر رضا، خواہ وہ مرضی کے موافق ہو یا خلاف، اور علیم وحکیم پروردگار کے لئے تسلیم وتفویض کا سبق ملتا ہے۔ (دلیل الفالحین، ج:۱، ص:۱۴۰)

میرے عزیز فرزند! تم اب اصطلاح کے مطابق علماء کی صف میں آ چکے ہو، تمہاری زبان، تمہاری نگاہ، تمہارا قلب گناہوں سے پاک ہونا چاہئے، دل جب گنہگار نہ ہوگا اور زبان بھی معصیت سے پاک ہوگی، تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ تمہارے اعمال درست ہوں گے اور خطائیں معاف ہوتی رہیں گی، سنو! ہمارے تمہارے اور ساری کائنات کے معبود برحق کیا فرماتے ہیں: **یَاأَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اتَّقُوا اللہَ قَوْلاً سَدِیْداً یُّصْلِحْ لَکُمْ أَعْمَالَکُمْ وَیُغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَمَنْ یُّطِعِ اللہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزاً عَظِیْماً** (سورۃ الاحزاب:) اللہ کا تقویٰ کیا ہے؟ معصیت سے دل کی حفاظت، اور قول سدید کیا ہے؟ زبان کی درستگی! ان دونوں پر دو وعدے اور ایک بشارت ہے! ایک وعدہ اصلاح اعمال کا، دوسرا

وعدہ مغفرتِ ذنوب کا، ان دونوں کا مجموعہ اطاعت الٰہی واطاعت رسول ہے، اس پر بشارت عظیم کامیابی اور بامرادی کی!

اس آیت کریمہ کو اپنا دستور العمل بنالو، زندگی کی تمام جزئیات اسی ایک کلی کے تابع کرلو، اور بے فکر اور مطمئن ہوکر زندگی گزارو، ہر مشکل آسان ہوگی، ہر غلطی درستگی کا راستہ ہموار کرے گی۔

یہاں ایک بات اور بھی ہے، جو بہت ضروری ہے، وہ یہ کہ اہل انتظام کی موافقت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کی خوشامد اور چاپلوسی کی جائے، بعض مدرسین اپنی خودغرضی اور دوسروں کی ایذارسانی کے لئے ناظم ومہتمم کا قرب خوشامد اور چاپلوسی کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں، اس کے لئے جھوٹی سچی باتیں بناتے ہیں، دل میں کچھ اور زبان پر کچھ یعنی منافقت کا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں، اور خود بھی ذلیل وخوار ہوتے ہیں اور مہتمم وناظم کو بھی گمراہ کرتے ہیں، نیز بہت سے اچھے اور کارآمد مدرسین کو اپنی اس حرکت سے پریشانی میں ڈالتے ہیں، یہ ایک مہلک بیماری ہے جو کمزور طبیعتوں میں سرایت کرتی ہے اور مدرسہ اور ادارہ کے زوال کا باعث بنتی ہے، اس مہلکہ سے بہت دور رہو۔

تنخواہ کا مسئلہ:

میں ملازمت کے پہلے موضوع پر بقدر ضرورت کلام کرچکا ہوں، اب اس کے دوسرے موضوع پر کچھ کہنا چاہتا ہوں، یہ ہے تنخواہ اور معاش کا مسئلہ! ابتدائے مکتوب میں کچھ اشارات اس کے متعلق گزر چکے ہیں۔

اس سلسلے میں مَیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، اور اب بھی کہتا ہوں کہ تنخواہ کو نہ مقصود بناؤ، اور نہ اسے ذریعۂ معاش قرار دو، میں یہ بھی نہیں کہتا کہ معاش کے لئے کوئی دوسرا کام اختیار کرو، میں جانتا ہوں کہ حصولِ معاش کے لئے کوئی دوسرا کام اختیار کروگے، تو اس کے

تقاضے کچھ دوسرے ہوں گے اور وہ تمہیں اس طرح اپنی گرفت میں لیں گے، کہ تعلیم دین سے رہ جاؤ گے، اس لئے کام تو یہی ایک کرو، لیکن یہ نہ قرار دو کہ تنخواہ تمہارے لئے ذریعۂ معاش ہے، ہاں یہ عطیۂ الٰہی ہے، حیلۂ روزی ہے، اسی کی راہ سے ضرورت کی تمام تر روزی ملتی رہا کرے گی، جب تم اللہ کے کام میں رہو گے، تو اللہ تعالیٰ تمہاری ضروریات کی کفالت فرمائیں گے، جو کچھ تھوڑی بہت تنخواہ تمہیں مل جائے، سو جان سے اللہ کا شکر ادا کرو، اس سے زیادہ کا مطالبہ دل میں بھی نہ لاؤ، یہ تنخواہ تمہاری پوری روزی نہ ہوگی روزی کا ایک جز ہوگی، اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو اسی میں برکت دے کر تمہارے تمام کاموں کو حل کر دیں گے، اور اگر چاہیں گے تو مزید اور کہیں سے عطا کر دیں گے، تمہارا وظیفہ تقویٰ اور توکل ہے، تقویٰ کی حقیقت گناہوں سے بچاؤ اور اطاعت سے لگاؤ ہے، اور توکل کی حقیقت اپنے آپ کو اللہ کی ذمہ داری میں دے دینا ہے، پھر دیکھنا روزی اور آسانی کے کتنے دروازے کھلتے ہیں، کیا تمہیں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر یقین نہیں ہے: **وَمَنْ یَّتَّقِ اللهَ یَجْعَلْ لَهٗ مَخْرَجاً وَیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَایَحْتَسِبُ وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ** (سورۃ الطلاق:) جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرتا ہے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ مشکل سے نکلنے کی راہ کھولتے ہیں، اور ایسی جگہ سے اسے روزی دیتے ہیں جہاں سے اس کا وہم وگمان نہیں ہوتا، اور جو کوئی اللہ پر توکل کرتا ہے، اس کے لئے اللہ ہی کافی ہے۔

جو علم تم نے پڑھا ہے، اس علم نے ہمیں یہی سکھایا ہے کہ اسباب سب ناتمام ہیں، لیکن اللہ کی طرف سے برکت مکمل ہے، ہم کو گنتی کا علم نہیں ہے برکت کا علم ہے، جس کا علم ہے اس سے صرفِ نظر کرنا، اور جس کا علم نہیں اس کے پیچھے دوڑنا نادانی ہے۔

اللہ سے مانگنا سیکھو، ان کی روزی بے حساب ہے، مجھے اپنی مدرسہ والی زندگی...... اور یہی کل میری زندگی ہے...... میں بار بار تجربہ ہوا ہے، میں نے کبھی روزی کی گنتی نہیں کی، اور نہ مدرسہ والوں کو اپنی روزی میں دخیل سمجھا۔ دینے والی ہستی وہی ہے چاہے ذرائع مختلف

رہے ہوں، کچھ مدرسے سے ملا، کچھ برکت ہوئی، کچھ نامعلوم ذرائع سے ملا مگر دینے والا ہاتھ ایک ہی رہا۔

میں تمہیں اپنے ابتدائی عہد مدرسی کا ایک تجربہ بتاتا ہوں، یہ اس وقت کی بات ہے جب مدرسہ میں میری تنخواہ فقط ایک سو پچہتر روپئے تھی، اور پڑھاتا تھا بارہ تیرہ کتابیں، عربی پنجم سے عربی دوم تک کی! اس وقت اولاد میں صرف تمہاری بڑی بہن تھی، ایک ماہ ایسا آیا کہ اس میں آدھی سے کچھ زائد تنخواہ ملی تھی، گھر میں دال، آٹا اور چاول موجود تھا، جو رقم ملی تھی وہ ختم ہوگئی، اب کچھ خریدنے کے لئے جیب میں کچھ نہ تھا، اس وقت قرض لینے کی ابھی ہمت نہیں ہوئی تھی، بس جو تھا وہ سادہ سادہ پکتا رہا، دال تھی تو بگھارنے کے لئے تیل نہ تھا، ترکاری اور گوشت کے نام پر کچھ نہ تھا، ایک ہفتہ اسی کیفیت میں گزرا، لیکن دل میں کبھی یہ خیال نہ آیا کہ جو تنخواہ ملنے سے رہ گئی ہے، اس کا تذکرہ میں مہتمم مدرسہ سے کردوں، روزانہ ملاقات ہوتی تھی، بہت بہت دیر تک باتیں بھی ہوتیں، مگر نہ کبھی میں نے ذکر کیا، اور نہ دل میں کوئی شکایت آئی، میں یہی سوچتا تھا، کوئی استحقاق تو ہے نہیں محض فضل الٰہی ہے، تو اپنے جیسے محتاج بندے سے کیا ذکر کروں؟ اور اس کی کیا شکایت کروں؟

ایک ہفتہ اسی طرح گزرا تھا کہ ایک روز بعد نماز عشاء دو بہت خاص مہمان وارد ہوئے، میں تو دال روٹی کھاچکا تھا، میں سوچ میں پڑ گیا کہ ان مہمانوں کو کیا کھلاؤں، گھر مدرسے سے دور تھا اور وہاں کا حال معلوم تھا۔ اب مجبور ہوا، ایک طالب علم کو بلایا کہ تمہارے پاس کچھ پیسے ہیں؟ اس نے بتایا کہ ہیں! میں نے کہا بازار جاؤ اور ہوٹل سے اچھا کھانا دو آدمی کے بقدر لاؤ۔ وہ لے آیا، میں نے ان مہمانوں کی خاطر اس سے کی، عشاء کے بعد کا وقت تھا، اس وقت تو یہ انتظام ہوگیا، اب پھر سوچتا رہا کہ صبح کو ناشتہ کیسے اور کیا کراؤں؟ گھر پر جو کچھ تھا وہ عرف ورواج کے اعتبار سے مہمان نوازی کے لائق نہ تھا، جیب میں پھوٹی کوڑی نہ تھی کہ کچھ اور انتظام کرتا، مگر طبیعت مطمئن تھی، گرمی کا موسم تھا، میں گیارہ بجے گھر پہونچا، کچھ سوچ

کر دل میں ایک فیصلہ کیا، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ سویا، پھر اٹھ گیا، کچھ نمازیں پڑھیں، پھر بالحاح وزاری اللہ سے دعا مانگی۔

اس وقت میری عادت تھی کہ صبح صادق سے پہلے گھر سے نکل جاتا، مدرسہ پہونچتے پہونچتے بیس منٹ کا وقفہ گزرتا، میں جا کر فجر کی اذان پکارتا، پھر طلبہ کو جگاتا، فجر کی نماز کے بعد مسجد سے نکلا تو مدرسہ کے مہتمم صاحب مل گئے، وہ بہت باتونی تھے، دیر تک باتیں کرتے رہے، پھر وہ رخصت ہوئے تو میں اپنے حجرے میں داخل ہوا، جونہی حجرہ کا دروازہ بھیڑا تھا کہ مہتمم صاحب آواز دیتے ہوئے پلٹ کر آئے، کہ میں کئی روز سے آپ کے لئے پیسہ جیب میں رکھے ہوئے ہوں، دینا بھول جاتا ہوں، ابھی یاد آیا، میں نے وہ پیسہ لے لیا، وہ ستر روپئے تھے، دروازہ بند کیا، اور جذبۂ شکر نے آنکھوں کے دہانے کھول دئے، جی بھر شکر الٰہی میں رویا، پھر عمدہ ناشتہ تیار کرایا، رخصت کرتے وقت دونوں کو کرایہ بھی دیا، پھر اس میں اتنی برکت ہوئی کہ کافی دنوں تک اسی سے کام چلتا رہا۔

یہ ایک واقعہ ہے، اور ابتداء کا ہے، اس کے بعد ۳۶/۳۵ سال میں اللہ جانے کتنے واقعات ایمان بڑھاتے رہے، آج سے بارہ تیرہ سال پہلے میں نے ’’تحدیث نعمت‘‘ کے عنوان سے اللہ تعالیٰ کے غیبی فضل وکرم کے واقعات کو جو میرے اوپر مدرسوں کے تعلق سے یا میرے گھر کے تعلق سے ہوئے، لکھنا شروع کیا تھا۔ بہت کچھ لکھنے کے بعد خیال آیا کہ تمہاری حیثیت ہی کیا ہے؟ یہ تو اپنے منہ میاں مٹھو بننے والی حرکت ہے، پس بند کر دیا، اور لکھا ہوا بھی ناپید کر دیا۔

تم میرے بیٹے ہو، تمہاری نصیحت کے لئے یہ لکھ دیا۔ بات یہ ہے کہ میں نے کبھی دنیا کے مال وجاہ کا ارادہ نہیں کیا، جو کچھ فضل الٰہی سے مل گیا شکر گزار رہا، اور ملا تو بہت ملا، میرے اندازۂ وہم وگمان سے بہت زیادہ ملا۔ یہ محض فضل ربی ہے، ورنہ میری ناکارگی مجھے کہیں کا نہ رہنے دیتی۔ بس پروردگار کا شکر ہے، میں تم لوگوں سے بھی یہی چاہتا ہوں کہ دنیا

کے مال وجاہ کو مقصود نہ بناؤ، اور نہ اسے اتنی اہمیت دو کہ زندگی کا زیادہ وقت یہی فکر گھیر لے، حدیث میں ہے:

من كانت الآخرة نيته جعل الله غناه فی قلبه وجمع له شمله وأتته الدنيا وهی راغمة ومن كانت الدنيا نيته فرق الله عليه شمله وجعل فقره بين عينيه ولم ياته الدنيا إلا ما قدر له (مسند دارمی، حدیث: ۲۳۵)

جس کا مقصد اور نیت آخرت ہوگی، اس کے قلب میں حق تعالیٰ غنا اور بے نیازی کی کیفیت پیدا کر دیں گے، اور اس کے احوال درست فرما دیں گے، اور دنیا اس کے پاس ناک رگڑتی آئے گی، اور جس کسی کی نیت دنیا ہوگی، اس کے اوپر اس کے احوال کو اللہ تعالیٰ پراگندہ کر دیں گے، اور اس کی نگاہوں کے سامنے فقر وتنگدستی مسلط کر دیں گے، اور دنیا تو بقدر مقدر ہی ملے گی۔

اس حدیث کو اپنا وظیفۂ زندگی بناؤ، اللہ کی رضا، آخرت کی فلاح کو اپنی تعلیم وتدریس کا مقصود بناؤ۔

مدرسہ کی دوسری ذمہ داریاں:

میرے استاذ گرامی حضرت مولانا افضال الحق صاحب قاسمی مدظلہٗ نے اس وقت جب میں رسمی طالب علمی سے فارغ ہو رہا تھا، چند نصیحتیں کی تھیں، وہ نصیحتیں میری زندگی میں بہت موثر ومفید ثابت ہوئیں، ان سے ایک نصیحت یہ تھی کہ:

> ’’جب تمہیں کوئی ذمہ داری مدرسہ اور امورِ مدرسہ سے متعلق دی جائے تو اسے خوشی سے قبول کرلو، معذرت نہ کرنا۔ ذمہ داری سے آدمی کی شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے، تجربہ بڑھتا ہے، زندگی کا شعور حاصل ہوتا ہے۔‘‘

میں حالانکہ جہاں تک مجھے اپنے بارے میں علم ہے، کسی کام اور کسی انتظام کا آدمی نہیں ہوں، مجھے پڑھنے اور پڑھانے کا شوق ہے، اس کے علاوہ کسی انتظام سے مجھے قطعی

مناسبت نہیں ہے، لیکن مولانا نے فرمایا تو میں نے مدرسہ کی کسی ذمہ داری سے معذرت نہیں کی، مدرسوں میں بیت الخلاء واستنجا خانہ کی صفائی اور فراشی سے لے کر مدرسوں کی نظامت تک ہر ایک ذمہ داری میں نے قبول کی، اور نصرت الٰہی کے کرشمے دیکھے ہیں، صرف تعمیرات کا شعبہ ایسا ہے جس سے مجھے قطعاً مناسبت نہ ہوسکی، اور بحمد اللہ اس کی ذمہ داری بھی مجھے کہیں نہیں دی گئی۔

اس کے ساتھ ایک بات بتاؤں، میں نے کسی ذمہ داری کا کوئی مالی معاوضہ نہیں لیا، اپنی ذمہ داری سمجھ کر کام کیا، صرف ایک مدرسہ میں طلبہ کی تقریری انجمن کے بہت سے ذمہ داروں کو معاوضہ تنخواہ میں محسوب کر کے دیا گیا، تو مجھے بھی اس میں شامل کیا گیا تھا، مگر میں نے اس کی طرف کبھی التفات نہیں نہ کیا، پھر اللہ نے متعینہ تنخواہ ہی میں اتنی برکت دی کہ بجز ابتدائی چند دنوں کے مجھے تنگدستی کا کبھی احساس نہیں ہوا۔

میں اپنے بیٹوں اور تلامذہ کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ وہ مال وجاہ کو مطمح نظر نہ بنائیں، یہ دونوں بقدر مقدر مل کر رہیں گے، نہ زیادہ نہ کم! دل کی توجہ کو دنیا میں نہ لگائیں، حتی الامکان دینے کا مزاج بنائیں، لینے کا مزاج صرف اللہ کی بارگاہ سے! مخلوق سے بالکل نہیں، وہ بہت کافی ہیں۔

میں نے سفر حج میں تم سے کہا تھا، کہ اللہ تعالیٰ نے روزی آسان فرمائی ہے تو اسی آسانی سے دوسروں پر خرچ کیا کرو، ملتی رہے گی، اور تم نے اس کا تجربہ بھی کرلیا ہے۔

بس مقصد صرف دین ہو، دین کی خدمت ہو، علم دین کی خدمت ہو، اور معاوضہ صرف اللہ سے مانگو، یہی تمام انبیاء کی سنت ہے، اور یہی بات اللہ کو پسند ہے، مدرسہ کو تجارت گاہ اور علم کو سامانِ تجارت نہ بناؤ، مدرسہ کی ذمہ داریوں کو کاروبار نہ سمجھو، جتنا ہوسکے مدرسہ کی خدمت کو دارین کی سعادت سمجھو، تم تو میرے ساتھ سفر حضر میں بہت رہے ہو، میرے سفروں سے مدرسہ کی کس قدر مالی اعانت ہوتی ہے، ایسا بھی کبھی ہوا کہ مالی اعانت ہی کے لئے میں

نے سفر کیا ہے اور حساب کتاب تمہارے ہاتھ میں رہا ہے، کبھی تم نے دیکھا کہ میں نے کرایہ، سفر خرچ، معاوضہ مدرسہ سے لیا ہو؟ ہاں مدرسہ کی طرف سے میری رعایتیں ہیں اور میں ان رعایتوں کا شکر گزار بھی ہوتا ہوں، اور حسن تلافی کا انتظام بھی کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ تمہیں توفیق دیں، میں نے بہت کچھ کہہ دیا، زندگی اور عمل کا یہی دستور بناؤ۔

تکملہ (۱)

حضرات اہل تدریس، علماء کی ایک اہم ترین جماعت ہیں۔ علماء دو طرح کے ہیں، علماء ربانیین اور علماء سوء! ان دونوں میں فرق و امتیاز کرنا ضروری ہے، تاکہ دانستہ یا نادانستہ علماء سوء کی صف میں نہ جا شامل ہوں۔

امام محمد بن حسین آجری علیہ الرحمہ نے رسالہ "اخلاق العلماء" میں دونوں گروہوں کے اوصاف و احوال لکھے ہیں، ہم انھیں قدرے تلخیص و اختصار کے ساتھ یہاں نقل کرتے ہیں۔

شہرت علم کے حقوق و آداب

تواضع:

اللہ تعالیٰ جب عالم کو شہرت و ناموری بخشیں اور مسلمانوں میں عالم کی حیثیت سے اس کا تعارف ہو جائے اور لوگ اپنی علمی ضروریات اس کے پاس لانے لگیں تو اس کا فریضہ ہے کہ خواندہ و ناخواندہ ہر ایک کے ساتھ تواضع کا برتاؤ کرے، اگر کوئی شخص علم میں اس کے ہم پایہ ہو تو اس کے سامنے تواضع و فروتنی اس لئے ضروری ہے کہ ملنے کا یہ انداز اس کے دل میں محبت و تعلق کا تخم بو دے گا، پھر اس طرح کے لوگ اس کے پاس آنا اور بیٹھنا پسند کریں گے، یہ موجود نہ ہوگا تو اس کی ملاقات کے لئے بیتاب ہوں گے۔ اپنے سے بڑے علماء کے ساتھ تواضع اس لئے ضروری ہے کہ علم یہی ادب سکھلاتا ہے اور اپنے سے کم علم لوگوں سے بھی تواضع ہی کا برتاؤ کرے کیونکہ علم کی فضیلت اور مرتبہ خدا کے نزدیک بھی اور بندوں کے

نزدیک بھی اسی تواضع کی وجہ سے ہے۔

خدا کی رضا:

ایسے عالم کو اپنے علم، اپنے صدق، اپنے حسن نیت، ہر حال میں خدا کی رضا پر ہی نگاہ رکھنی چاہئے، اپنے علم کو زینہ بنا کر بادشاہوں کے دربار تک چڑھنے کی کوشش بالکل نہ کرے، نہ اپنے علم کو ان کے پاس لے کر جائے، علم کو نااہلوں سے بچائے اور اس پر کوئی اجرت اور معاوضہ نہ قبول کرے، علم کو ضروریاتِ دنیوی پورا کرنے کا ذریعہ نہ بنائے، ایسا ہرگز نہ ہو کہ دنیاداروں کا قرب اختیار کرے اور فقراء سے دور بھاگے، لیکن یہ بھی نہ ہو کہ دنیاداروں سے بالکل ہی کنارہ کشی اختیار کر لے، فقراء اور نیکوکاروں سے جھک کر ملے تاکہ وہ لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

مجلس کا انداز:

اور اگر اس نے کسی علمی مجلس کا اہتمام کر رکھا ہو تو شرکاء مجلس کے ساتھ حسن مدارات کے ساتھ پیش آئے، سوال کرنے والوں سے نرم برتاؤ کرے، اور اہل مجلس کے ساتھ حسن اخلاق اختیار کرے اور بدخلقی سے پرہیز کرے۔ شرکاء مجلس میں جو لوگ کند ذہن ہوں ان کے حق میں صبر سے کام لے تاکہ وہ بات کو اچھی طرح سمجھ لیں، اگر کوئی گستاخی کرے تو اسے نرمی سے برداشت کرے، اہل مجلس کو اچھے آداب واخلاق کا خوگر بنائے، انھیں لایعنی مشغولیات میں مبتلا ہونے سے بچائے اور جو کچھ علمی فیضان کر رہا ہے اس کی جانب انھیں متوجہ کرتا رہے اور انھیں پابند بنائے کہ خاموشی کے ساتھ اس کا کلام سنیں اور اگر کسی سے علماء کی شان کے خلاف کسی عمل یا اخلاق کا صدور ہو تو اس کو محض خاموش کرنے اور اس پر حجت قائم کرنے کے لئے زجر وتوبیخ نہ کرے بلکہ اسے نرمی اور آہستگی سے سمجھا دے کہ اس طرح کا عمل اہل علم کی شان سے گرا ہوا ہے، اہل علم کو اس سے دور رہنا چاہئے، اس طرح سمجھائے

کہ بات اس کے دل میں گھر کر جائے اور محض اس کی نرمی و ملاطفت کی وجہ سے وہ اس عمل کے ترک پر آمادہ ہو جائے۔

سوال کرنے والوں کی رعایت:

اگر کوئی شخص لایعنی اور بے کار سوال کرے تو اسے روک دے اور بتائے کہ کام کی باتیں پوچھا کرو، اگر دیکھے کہ جس علم کی انھیں ضرورت ہے اس سے غفلت برت رہے ہیں تو اسے ظاہر کر دے اور انھیں سمجھائے کہ اس علم کے وہ کس درجہ محتاج ہیں، پوچھنے والے کو ہرگز نہ جھڑکے، اس سے خوامخواہ اس کی رُسوائی ہوگی، اور نہ سختی کے ساتھ اسے روکے، اس سے عالم کی وقعت اس کے دل سے نکل جائے گی، لیکن اسے سوال پورا کرنے کی اجازت دے تا کہ اس کا مطلب بخوبی سمجھ سکے اور اسے ان علوم ضروریہ کی ترغیب دے جن کا تعلق فرائض کی ادائیگی اور محرمات سے اجتناب کے ساتھ ہے، ایسا شخص جس کے سوال کا مقصد یہ معلوم ہو کہ وہ اس علم کا محتاج ہے اور اس پر اسے عمل پیرا ہونا ہے، اس پر پوری توجہ کرے، اور اگر یہ محسوس ہو کہ اس کے سوال کا مقصد محض بحث اور مناظرہ ہے تو اس سے اعراض کرے، جن کوتاہیوں اور نقصانات کو وہ دور سمجھ رہے ہوں حکمت و دانائی سے ان کا قریب ہونا ظاہر کرے، گستاخ کے سامنے حلم و متانت اختیار کر کے خاموشی کو ترجیح دے، اور خیر خواہی کے ساتھ علم و حکمت کا فیضان کرتا رہے، اہل مجلس کے حق میں اس طرح کے اخلاق و آداب کی رعایت کرے۔

جواب کے آداب:

اور جو لوگ اس سے علم اور مسائل کی تحقیق کرنا چاہتے ہوں اس کے متعلق یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ اگر اس کے پاس علم ہو تو جواب دے اور اس کا اصول یہ ہے کہ جواب قرآن و سنت سے ہو یا اجماع سے، اگر کوئی ایسا مسئلہ ہو جس میں اہل علم کا اختلاف ہے تو

پوری کاوش سے دیکھے کہ کون سا قول کتاب وسنت اور اجماع سے قریب تر ہے، اس پر فتویٰ دے، اور بحث وتحقیق میں اقوالِ صحابہ اور ان کے بعد کے فقہاء کے اقوال سے باہر نہ نکلے۔ اگر اس کی تحقیق کسی صحابی یا کسی امام کے قول کے موافق ہے تو اسی کو اختیار کرے، اور اگر اس کی تحقیق اقوال صحابہ اور اقوال الائمہ کے دائرہ سے باہر نکل رہی ہے تو ہرگز اسے اختیار نہ کرے، اپنی رائے کو ناقص سمجھے، اور اگر اس سے بڑا کوئی عالم موجود ہے تو اس سے دریافت کرے تاکہ حق اس پر واضح ہو اور خدا سے بھی دعا کرتا رہے کہ وہی خیر وحق کی توفیق عنایت فرمائیں۔

اگر سوال ایسا ہے جس کا جواب معلوم نہ ہو تو اپنی لاعلمی کے اظہار میں قطعاً نہ شرمائے اور اگر مسئلہ ایسا ہو کہ اس کے اظہار سے لوگوں میں خوانخواہ ہیجان اور شور وشغب ہوگا تو اس کے بتانے سے معذرت کرے، اور نرمی ومہربانی کے ساتھ اس سے بہتر کی جانب متوجہ کردے، اگر کسی مسئلہ میں فتویٰ دینے کے بعد معلوم ہو کہ اس سے غلطی ہوئی تو اس سے رجوع کرلے، اگر اس نے کوئی بات کہی پھر دوسرے کسی عالم نے اس کی تردید کی، خواہ تردید کرنے والا اس سے بڑا ہو یا اس کے ہم رتبہ یا اس سے کم درجہ، ہر صورت میں اگر اس پر واضح ہوجائے کہ حق بات وہی ہے جو دوسرے نے کہی تو بلاتأمل مان لے، اور اس کا شکر گزار ہو اور اس کا بہتر بدلہ دے۔

اگر اس سے ایسا کوئی مسئلہ دریافت کیا گیا جس میں قول فیصل کی وہ تعیین نہیں کرپارہا ہے، تو بے تکلف کہہ دے کہ کسی اور سے معلوم کرلو۔ جس مسئلہ میں تردد ہو، اس کے جواب میں خوانخواہ تکلف نہیں کرنا چاہئے۔ مسائل بدعیہ سے سخت احتراز کرے، اہل بدعت کی بات ہرگز نہ سنے، نہ اہل بدعت کی مجالست اختیار کرے اور ان سے بحث ومباحثہ بھی نہ کرے، اصل علم کتاب وسنت، طریقۂ صحابہ وتابعین اور اقوال ائمہ ہیں، اتباع کا حکم دے اور ابتداع سے منع کرے، علماء سے بحث وجدال نہ کرے اور نہ بیوقوفوں سے الجھے، تلاوتِ کلام

اللہ اس نیت سے کرے کہ اللہ کی مرضی پا سکے، اور سنت میں اشتغال اس لئے رکھے کہ اللہ کے حقوق و آداب ضائع نہ ہونے پائیں، اور عبادتِ الٰہی کے طریقے معلوم ہوتے رہیں۔ غافلوں کو نصیحت کرے، جاہلوں کو علم سکھائے، حکمت کی بخشش، جو اس کے اہل ہوں ان پر کرے، اور نااہلوں سے اسے محفوظ رکھے، ایسے عالم کی مثال طبیب جیسی ہے، طبیب جانتا ہے کہ دوا کس موقع پر فائدہ کرے گی۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے علمی شہرت عطا فرمائی ہو، انھیں اس جیسے اخلاقِ فاضلہ اور اوصافِ حمیدہ کا حامل ہونا چاہئے، جس قدر اس کے علم میں اضافہ ہو اس کی تواضع وخشیت بڑھتی رہے، سربلندی کا طالب محض خدا سے ہو، پھر علم کی وجہ سے جو حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں ان کے متعلق شدت کے ساتھ خدا سے ڈرتا بھی رہے۔

☆☆☆☆☆

عوام الناس کے ساتھ معاشرت

جس قسم کے عالم دین کا ذکر ہم کر رہے ہیں، اس کے اخلاق کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ معاملہ کرنیوالا، اس کے شر سے مطمئن رہتا ہے اور اس کا ہمنشیں اس کے خیر کا امیدوار ہوتا ہے، وہ چھوٹی باتوں پر گرفت نہیں کرتا، کسی کی غلطی کا چرچا نہیں کرتا، کسی کی چغلخوری کی وجہ سے تعلقات منقطع نہیں کرتا، اگر کسی سے رنجش ہوتی ہے تو اس کے پوشیدہ راز نہیں کھولتا، اور نہ ناحق اس سے انتقام لیتا، بلکہ اسے معاف کرتا اور اس سے درگزر کرتا ہے، حق کے سامنے سپر انداز اور باطل کے حق میں سخت ہوتا ہے، اپنی ایذاء پر غصہ پی جانے والا اور خالق کی نافرمانی پر سخت بغض رکھنے والا، بیوقوف کا جواب خاموشی سے اور عالم کا جواب اس کی بات کی قبولیت سے دیتا ہے، نہ مداہنت کرتا نہ دشمنی رکھتا، نہ اتراتا، نہ حسد کرتا، نہ کینہ پرور ہوتا، نہ بیوقوف ہوتا، نہ خشک ہوتا، نہ سخت دل ہوتا، نہ طعنہ دیتا، نہ طنز کرتا، نہ غیبت کرتا، نہ بُرا بھلا کہتا، جو احباب خدا کی طاعت میں اس کے مددگار ہوتے ان کی صحبت

اختیار کرتا ہے، اور جن چیزوں سے خالق کی ناراضگی ہوتی ہے ان سے منع کرتا ہے، جن لوگوں کی طرف سے اطمینان نہیں ہوتا، اپنے دین وایمان کی حفاظت کی خاطر ان کے ساتھ بھی حسن سلوک کرتا ہے، بندوں کے حق میں صاف دل، کینہ اور حسد سے پاک ہوتا ہے، اہل ایمان کے لئے اس کے دل میں آخری امکانی حد تک حسن ظن کا جوش ہوتا ہے، کسی کی نعمت وخوشی کا زوال نہیں چاہتا، اس کی نرم دلی کی وجہ سے اگر کوئی گستاخی کر بیٹھتا ہے تو اس کے ساتھ بھی مدارات ہی کا برتاؤ کرتا ہے، اگر کسی کی جہالت وگستاخی سے کبھی اسے حیرت واستعجاب ہونے لگتا ہے تو وہ یہ سوچ کر اپنی حیرت دور کر لیتا ہے کہ اللہ عزوجل کے حق میں میری جہالت اور گستاخی اس سے کہیں بڑھی ہوئی ہے، اس سے کسی بدی کا اندیشہ اور کسی دغا کا خوف نہیں ہوتا، عام لوگ اس سے راحت میں ہوتے ہیں، البتہ خود اس کا نفس پوری مشقت میں رہتا ہے۔

☆☆☆☆☆

خدا کے حضور میں

ایک عالم ربّانی کے یہ جتنے اوصافِ حمیدہ اور اخلاق فاضلہ ہم نے ذکر کئے، یہ سب خداوند تعالیٰ کی توفیق سے کسی ایسے عالم میں جمع ہوتے ہیں، جسے ان سب کی توفیق مل گئی ہو، پھر ظاہر ہے کہ خود خدا تعالیٰ کی جناب میں اس کے ذوقِ عبودیت اور شوقِ طاعت کا کیا حال ہوگا۔ یقیناً حق تعالیٰ اس کے قلب کو وہ کیفیت عطا فرما دیتے ہیں کہ اسے ایک طرح کی خصوصیت اور امتیاز حاصل ہو جاتا ہے، اور یہ اس علم کی برکت ہے جس سے حق تعالیٰ نے اسے نواز کر انبیاء کا وارث اور اولیاء کا قرۃ عین اور بیمار دلوں کا مسیحا بنایا ہے۔

اس کا حال سنئے! وہ خدا تعالیٰ کا شاکر وذاکر ہوتا ہے، محبت خداوندی کی حلاوت سے سرشار، مناجاتِ الٰہی میں فارغ ویکسو، تمامتر طاعت وعبادت کے باوجود اپنے آپ کو

گنہگار و خطا کار شمار کرتا اور حسن عمل پر دوام کے باوجود خود کو پُر تقصیر سمجھتا ہے، خدا کی پناہ اس نے ڈھونڈھی، خدا نے اسے قوت بخشی، خدا پر اعتماد و توکل کیا پھر کسی کا خوف دل میں نہیں لایا، اللہ کو پا کر ہر چیز سے بے نیاز ہو گیا، ہر چیز میں خدا ہی کا محتاج رہا، اس کو اُنس ہے تو محض اللہ سے، اور وحشت ہر اس چیز سے ہے جو خدا سے اسے ہٹا دے، اس کا علم بڑھتا ہے تو خدا کی حجت پختہ ہونے سے خائف ہوتا ہے، سابقہ اعمال صالحہ کے سلسلے میں عدمِ قبولیت سے ڈرتا رہتا ہے، تلاوت کلام اللہ کرتے وقت اس کی فکر رہتی ہے کہ اپنے مولیٰ کی بات سمجھ لوں اور سنت رسول میں اشتغال اس لئے ہوتا ہے کہ اس میں تفقہ حاصل کر لے، مبادا کوئی حکم ضائع نہ ہو جائے، قرآن وسنت کے آداب سے مزین ہوتا ہے، اہل دنیا سے دنیاوی عزت کے سلسلے میں کوئی مسابقت نہیں کرتا اور دنیاوی ذلت سے اسے کچھ گھبراہٹ نہیں ہوتی، زمین پر تواضع، وقار اور سکون کے ساتھ چلتا ہے، اس کا دل ہر وقت عبرت پذیری میں مشغول رہتا ہے، اگر کبھی اس کا دل اللہ کی یاد سے خالی ہو جائے تو اس کے نزدیک سخت مصیبت ہے، اگر اللہ کی اطاعت بغیر حضور قلب کے ہو تو سخت محرومی اور خسارہ، ذاکروں کے ساتھ ذاکر، غافلوں کی حالت سے عبرت پذیر، اپنے عیوبِ نفس سے واقف اور اسے مُتَّہم جاننے والا، علوم میں اتنی وسعت کہ سمجھ بالکل کھلی ہوئی، جس کا اثر یہ ہے کہ ذاتِ حی و قیوم سے حیا و شرم اس کے دل میں سما گئی، تمام اعمال میں مشغولی بحق مسلسل اور ماسوا اللہ سے انقطاع و یکسوئی مکمل۔

☆☆☆☆☆☆

علماءِ سوء کے اوصاف و عادات:

اگر کوئی مجھ سے کہے کہ اچھا ہمارے سامنے ایسے علماء کے کچھ احوال بیان کر دو جن کا علم ان کے خلاف ان پر حجت ہے تا کہ ہم کسی اہل علم کو دیکھیں تو پہلے اس کے احوال و اخلاق کو پرکھ لیں، اگر اس میں ایسے اخلاق و عادات ہوں جو اہل علم کی شان کے لائق نہیں

ہیں تو ہم ان سے اجتناب کریں اور سمجھ لیں کہ ابھی ان کی جو باتیں پوشیدہ ہیں وہ ان سے بھی بدتر ہوں گی جو ظاہر ہوگئیں اور ہم یہ بھی جان لیں کہ یہ شخص فتنہ ہے تو اس سے پرہیز ہی کرنا چاہئے، کہیں ہم بھی اسی کی طرح فتنہ میں نہ پڑ جائیں۔ واللّٰہ موفقنا للرشاد

ہم عرض کریں گے ٹھیک ہے ہم کچھ ایسی باتیں بیان کئے دیتے ہیں جنھیں اہل علم سن لیں اور غور کرلیں کہ ان میں یہ اخلاق مذمومہ اور عادات قبیحہ موجود تو نہیں ہیں، اگر ہوں تو اللہ سے معافی چاہیں، اور ان سے فوراً باز آجائیں، اور وہ اخلاق اختیار کریں جو اہل علم کی شان کے مناسب ہیں، جن سے حق تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور ایسی عادات یکلخت ترک کردیں جن سے حق تعالیٰ کی جناب سے دوری ہوتی ہو۔

ایسے عالم کی ایک بے ہودہ صفت یہ بھی ہے کہ نمائش کے لئے علم حاصل کرتا ہے اور لڑنے کے لئے دلائل فراہم کرتا ہے، جس سے تعلق ہوتا ہے اسے فتویٰ میں سہولت دیتا ہے، اور جس سے تعلق نہیں ہوتا اس کے حق میں تشدد کرتا ہے، بعض رائیں اسے ناپسند ہوتی ہیں لیکن اہل تعلق کو ضرورت ہوتی ہے تو سہولت کے خیال سے وہی ناپسندیدہ مسئلہ بتادیتا ہے، بلکہ اس پر عمل بھی کرلیا کرتا ہے، جس کو پڑھاتا ہے تو اسلئے پڑھاتا ہے کہ دنیا کا کچھ نفع حاصل ہو، اگر یہ مقصد پورا ہوتا ہے تو آسانی سے اسے پڑھا دیتا ہے اور اگر یہ مقصد پورا ہوتا دکھائی نہیں دیتا بلکہ صرف حصول آخرت ہی اس پر مرتب ہوتا ہے، تو اسے گرانی ہونے لگتی ہے، ایسے علم پر بھی ثواب کی امید باندھتا ہے جس پر اس کا عمل نہیں۔ یہ نہیں سوچتا کہ اس پر کتنا سخت مواخذہ ہوگا۔ جن لوگوں کے احوال مستور ومخفی ہیں ان کے ساتھ بدگمانی قائم کرکے اللہ سے ثواب کی امید رکھتا ہے اور اس کا خوف اسے نہیں ہوتا کہ دنیاداروں کے ساتھ مداہنت کا برتاؤ کرکے خدا کے غضب میں گرفتار ہوچکا ہے، حکمت کی باتیں بولتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ وہ اس کا اہل ہے اور یہ نہیں خیال کرتا کہ ترکِ عمل کی وجہ سے اس پر حجت الٰہی قوی ہوتی جارہی ہے، کوئی بات جان لیتا ہے تو فخر وغرور سے اس کا سر اونچا ہوجاتا ہے اور

اگر کوئی بات نہیں جانتا اور اسے ضرورت ہوتی ہے تو عار کی وجہ سے اسے چھوڑ دیتا ہے۔

اگر اس کے دَور میں علماء کی تعداد زیادہ ہو اور زمرۂ علماء میں ان کا شمار ہوتا ہو تو چاہتا ہے کہ اس کا بھی تذکرہ ان میں ہو۔ اگر کسی مسئلہ میں اس سے سوال نہ کیا جائے اور دوسرے علماء سے پوچھا جائے تو اس کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ مجھ سے دریافت کیا جائے، حالانکہ اس پر اسے خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے تھا کہ چلو میں ذمہ داری سے چھوٹا، اور اگر کسی دوسرے نے مسئلہ بتایا اور اس کا بتایا ہوا مسئلہ غلط ثابت ہو گیا تو اسے بہت خوشی ہوتی ہے، حالانکہ اسے رنج ہونا چاہئے تھا۔ اگر کسی عالم کی وفات ہوتی ہے تو یہ خوش ہوتا ہے کہ اب لوگ اس کے محتاج و نیاز مند ہوں گے، اگر اس سے کوئی ایسی بات پوچھی جائے جو اسے معلوم نہ ہو تو اسے اپنی لاعلمی کا اقرار کرنے میں عار محسوس ہوتا ہے اور تکلف کر کے ایسا جواب دیتا ہے جس کی گنجائش نہیں ہوتی، اگر اسے معلوم ہو کہ فلاں آدمی مسلمانوں کے لئے اس سے زیادہ مفید ہے تو اس کی زندگی اسے ناپسند ہو جاتی ہے اور لوگوں کی رہنمائی اس کی جانب نہیں کرتا۔ اگر اس نے کوئی بات بتائی اس کی یہ بات مان کر لوگوں نے اتباع کر لیا اور جاہلوں کے نزدیک اس کی وجہ سے ایک مقام و مرتبہ اسے حاصل ہو گیا، پھر معلوم ہوا کہ بات غلط تھی، تو اب اسے اپنی غلطی کا اعتراف کرنے میں عار محسوس ہوتا ہے۔ غلطی کا اعتراف تو ایک طرف رہا اس اندیشہ سے کہ اس کا مرتبہ مخلوق کی نگاہ سے گر نہ جائے، اپنے اس غلط قول کی حمایت میں دلائل فراہم کرنے لگتا ہے۔

اپنے کو زمرۂ علماء میں شمار کرتا ہے، حالانکہ اعمال اسکے سب احمقوں والے ہیں۔ دنیا کی محبت، جھوٹی تعریف کی خواہش اور جاہ و منزلت کی حرص نے اس کو فتنہ میں ڈال رکھا ہے، علم کے ذریعہ اپنی ایسی آرائش کرتا ہے جیسے کوئی خوبصورت عورت کپڑوں سے اپنے کو سنوارتی ہے، لیکن اپنے علم کو عمل سے مزین نہیں کرتا۔

ہر عالم کو چاہئے کہ ان خصائل پر اچھی طرح غور کر لے، اگر اس کے اندر ان باتوں

میں سے کوئی چیز موجود ہو تو اللہ سے شرمائے اور فوراً درستگی اور حق کی جانب رجوع ہو، اب ہم اس سلسلے میں کچھ آثار و روایات نقل کرتے ہیں۔

فکر معاش:

اس قسم کے عالم کی ایک صفت یہ ہے کہ اس کی فکر زیادہ تر معاش کے ساتھ وابستہ رہتی ہے، فقر و غربت کے اندیشہ سے ایسے مواقع میں بھی جا پڑتا ہے، جو جائز نہیں ہوتے، جتنی روزی مل چکی ہے اس پر قانع نہیں، اور جو کچھ تقدیر سے ابھی نہیں حاصل ہوا ہے، اس کے بارے میں یہ بدگمانی کہ کس قدر تاخیر ہو رہی ہے، اس کے قلب و دماغ پر شغل دنیا ہر وقت مسلط رہتا ہے، اور ذکر آخرت محض وسوسہ کے درجے میں اس کے دل میں گزرتا ہے، دنیا کو بڑی مشقت اور حرص و آرزو سے حاصل کرتا ہے، اور آخرت کے باب میں نری تمناؤں اور ٹرخانے سے کام لینا چاہتا ہے، گناہ کرتا ہے تو اللہ سے پُر امید رہنے کو یاد کرتا ہے اور اسی پر جما رہتا ہے اور طاعت کرنی ہوتی ہے تو اپنا عجز و ضعف سوچ کر اس سے رُک جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خدا کے ساتھ اسے حسن ظن ہے، اور خدا کے عفو و درگزر پر اسے اعتماد ہے، جبکہ خدا نے ایسا کچھ ذمہ نہیں لیا ہے اور رزق کے باب میں جس خدا نے ذمہ لے رکھا ہے، نہ اس سے حسن ظن رکھتا ہے اور نہ اس پر بھروسہ کرتا ہے، بلکہ ہر وقت اس کا دل مضطرب اور مشغول رہتا ہے جبکہ اسے اپنے رب پر اطمینان رکھنے کا حکم ہے، موت کے ذکر پر اسے بالکل اطمینان سا رہتا ہے، حالانکہ اس وقت اضطراب ہونا چاہئے، اگر معاش کی طرف سے کوئی اندیشہ و خوف ہو تو کسی طرح اسے قرار نہیں آتا، حالانکہ خدا نے اس کی ذمہ داری لی ہے، اور اس کا اطمینان ہے کہ جتنی روزی مقدر ہے وہ مل کر رہے گی، لیکن جس چیز کا خدا نے اطمینان دلایا ہے اس پر تو اضطراب ہے، اور جس سے ڈرایا ہے اس پر بالکل اطمینان ہے، اللہ تعالیٰ کچھ دنیا عطا فرما دیتے ہیں تو اتنا خوش ہوتا ہے کہ اس کا شکر تک یاد نہیں رہتا، اور مصائب پر اتنا مغموم

و پریشان ہوتا ہے کہ رضا بالقضا تک کو فراموش کر بیٹھتا ہے۔

اگر کوئی حادثہ یا ضرورت سامنے آجائے تو پریشان ہو کر بندوں کے پاس پہونچتا ہے اور ان سے اعانت کا طالب ہوتا ہے، اور خدا کی جانب اس وقت رجوع ہوتا ہے جب مخلوق سے ہر طرح مایوسی ہو جاتی ہے، اگر کسی مخلوق کے قرب وتعلق کی امید ہوتی ہے تو خدا کو قطعاً بھول جاتا ہے، کسی نے اس کے ساتھ حسن سلوک کر دیا تو دل کی ساری مشغولیت اسی کے دامن میں بندھ جاتی ہے، اس کا تذکرہ، اس کی محبت اور اس کی شکر گزاری، بس دن رات کا یہی مشغلہ ہو جاتا ہے اور خدا کو بالکل بھلا بیٹھتا ہے، اگر ایسے شخص پر اسے مال خرچ کرنا پڑے جو اس کی مکافات نہ کر سکے، اور محض خدا سے اس کی جزاء کی امید ہو تو تھوڑا مال خرچ کرنے میں بھی اسے گرانی ہوتی ہے اور اگر ایسا شخص ہے کہ مال خرچ کرنے سے وہ اس کا بدلہ چکائے گا یا اس سے کسی اور رُخ سے حصول دنیا کی توقع ہے، تو اس کو زیادہ سے زیادہ مال خرچ کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے، جس سے محبت وتعلق ہوتا ہے اس کی جھوٹی تعریفیں کر کے گناہ میں مبتلا ہوتا ہے، اور جس سے بغض وعداوت ہوتی ہے اس کی ناحق مذمتیں کر کے معصیت میں گرفتار ہوتا ہے، بدگمانیوں کو یقین کا درجہ دے دیتا ہے، تہمتوں کو سچ جانتا ہے، جو شخص اپنا انتقام لینے کی قدرت رکھتا ہے یا لوگوں کی مدد اسے حاصل ہے، اس پر ظلم کرنے کو غلط سمجھتا ہے، لیکن اگر کسی کا حامی وناصر بجز خدا کے کوئی نہ ہو تو اس پر ظلم کو بالکل روا رکھتا ہے، خدا کا ذکر اس پر بہت گراں اور فضول بکواس اس کو بہت آسان، اگر خوشحال ہے تو بہت خوش، بالکل غافل، بڑا ظالم، بے انتہا سرکش اور باغی، اور خوشحالی ساتھ چھوڑ دے تو اپنے فرائض منصبی تک سے بے نیاز ہو جاتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ بس اب کبھی خوشی ومسرت حاصل نہ ہوگی۔

بیمار پڑ جائے تو توبہ واستغفار اور اظہارِ ندامت کرنے لگے، اور یہ معاہدہ کہ اب کبھی گناہ نہ کروں گا، پھر تندرست ہو جائے تو فوراً عہد توڑ دے اور سابقہ حالات پر لوٹ

آئے، اگر مخلوق سے کوئی اندیشہ ہو، یا ان کی دنیا کی توقع ہو تو اپنے مولیٰ کو ناراض کر کے انھیں راضی کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور اگر اپنے گمان کے مطابق خدا سے خوف کرتا ہے تو مخلوق کو ناخوش کر کے خدا کو خوش کرنے کی ہمت نہیں کرتا، اپنے سے طاقتور بندوں کے شر سے خدا کی پناہ چاہتا ہے، لیکن اپنے سے کمزور مخلوق کو اپنے شر سے پناہ نہیں دیتا، غصہ کو نافذ کر کے اس کے دل کو شفا ہوتی ہے، اگرچہ اس کا رب ناراض ہو جائے، معاش میں جو لوگ اس سے برتر ہیں، ان پر نگاہ رکھتا ہے، اور ان کے لحاظ سے اپنے اوپر خدا کی نعمتوں کو بہت قلیل سمجھتا ہے اور اس پر شکر گزار نہیں ہوتا، اور جو لوگ اس سے کمتر ہیں انھیں نہیں دیکھتا کہ ان کے لحاظ سے حق تعالیٰ کا شکر ادا کر سکے، فضول کاموں کی مشغولیت میں اتنا انہماک ہوتا ہے کہ نمازیں اخیر وقت تک ٹال دیتا ہے، پھر جب پڑھتا بھی ہے تو غفلت کے ساتھ، اس میں خدا کی تعظیم بالکل نہیں ہوتی، اگر امام لمبی نماز پڑھادے تو اُکتانے لگتا ہے اور اس کی شکایتیں کرتا ہے اور اگر مختصر نماز پڑھائے تو بہت خوش ہوتا ہے اور اس کی تعریفیں کرتا ہے، اگر شدائد و مصائب میں مبتلا نہ ہو تو دعا کرنے کی نوبت بہت کم آتی ہے، اور دعا کرتا بھی ہے تو دل دنیا ہی میں پھنسا رہتا ہے۔

☆☆☆☆☆

تکملہ (۲)

عزیزم! تدریس اور اساتذہ سے متعلق ضروری باتیں میں نے قدرے تفصیل سے لکھ دی ہیں، اس قدر لکھنے کے بعد مجھے بوسیدہ کاغذات میں، اپنی ایک پرانی تحریر ملی، جو غالباً آج سے سولہ سال قبل دار العلوم دیوبند کی دعوت پر ایک نمائندہ اجتماع میں پیش کرنے کے لئے لکھی تھی، اسے بھی لکھے دیتا ہوں، قند مکرر کا لطف آئے گا، اور یاددہانی کی تکرار سے مزید توجہ ہوگی، اسے بھی بغور پڑھو، ان شاء اللہ کچھ جدید فوائد بھی حاصل ہوں گے۔

جیسا کہ معلوم ہے کہ تعلیم کے تین ارکان ہیں۔ اوّل اساتذہ، دوسرے طلبہ، تیسرے نصاب تعلیم۔ نصاب تعلیم پر تو بہت اظہار خیال کیا جاتا ہے، مگر اس سے اہم یہ ہے

کہ اساتذہ وطلبہ پر توجہ دی جائے، انھیں دونوں کے طریقۂ کار کو مجموعی اعتبار سے ''طریقۂ تعلیم وتربیت'' کہا جاسکتا ہے، اس سلسلے میں چند باتوں کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔

(۱) **تصحیحِ نیت**: پہلی چیز یہ ہے کہ طلبہ ہوں یا اساتذہ، سب اپنی نیت کی تصحیح کا التزام کریں، یعنی دینی تعلیم کا حصول اور اس کی اشاعت وتدریس صرف اس لئے ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جناب سے ایک فریضہ ہے، اسی سے دین کے احکام اور رضائے خداوندی کے طریقوں کا علم ہوتا ہے۔ آج دوسری دنیاوی تعلیموں کی طرح دینی تعلیم بھی تحصیل معاش کے لئے ذریعہ بن گئی ہے، نیت کی خرابی کی وجہ سے دینی علوم کا تقدس دلوں میں باقی نہیں رہتا، اور تحصیل علم میں محنت اور مطالعۂ ومذاکرہ کی بھی ضرورت نہیں محسوس ہوتی، کیونکہ معاش کے لئے سرے سے علم ہی کی ضرورت نہیں ہے، پھر اس کے لئے محنت ومشقت کا دردِ سر کون مول لے، نیت کا فساد پورے مدرسہ کے ماحول کو فاسد کردیتا ہے، اساتذۂ کرام خود بھی اپنی نیت کی دیکھ بھال کرتے رہیں، اور طلبہ کو بھی بار بار یاد دلاتے رہیں، نیز اساتذہ کسی صاحب دل مخلص، اللہ والے کی صحبت اور تعلق کی پابندی کریں، اللہ والوں کی صحبت کیمیا کی تاثیر رکھتی ہے، اساتذۂ کرام ایسے اللہ والوں کی تلاش میں رہیں جن کی صحبت میں زہد وقناعت، للّٰہیت وخلوص، دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی فکر پیدا ہو، اللہ کی محبت دل میں جاگزیں ہو، رسول اکرم ﷺ سے صحیح نسبت قائم ہو، اس تلاش اور اس فکر سے غافل نہ ہوں، پھر جہاں ان کا علم اور قلب مطمئن ہوجائے اس کی خدمت میں رہ کر قلب میں اور علم میں نور حاصل کریں، یہ کہہ کر ٹال نہ دیں کہ اب بزرگوں کا وجود کہاں؟ یا کیا ضرورت ہے بزرگوں کی صحبت کی؟ ہم تو خود دینی تعلیم کے حامل ہیں اور امکانی حد تک اس پر عامل ہیں، اس دھوکے میں ہرگز نہ آئیں، ذرا مخلص علماء ومشائخ کے حالات وسوانح کا مطالعہ کریں تو اپنی کمی کا واضح طور پر احساس ہوگا۔

(۲) **درس کی تیاری**: اساتذہ پڑھانے کے لئے باقاعدہ تیاری کریں، پڑھانے سے پہلے پورے سبق کو اپنے ذہن میں مستحضر کریں تاکہ اس کا کوئی جز ان کے ذہن

سے اوجھل نہ ہو، اور تاکہ وہ طلبہ کو انشراح کے ساتھ پڑھا سکیں۔

(۳) **طلبہ کی عبارت خوانی**: طالب علموں کو مطالعہ کا پابند بنائیں، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس قدر سبق پڑھانا ہو، اس کی عبارت پڑھنے کا مکلّف ہر طالب علم کو بنائیں، تھوڑی تھوڑی عبارت وقت کی گنجائش کے لحاظ سے ہر ایک طالب علم سے پڑھوائیں، اور عبارت کی غلطی پر سرسری روک ٹوک کریں اور اصلاح کی طرف توجہ دلائیں، اصلاح میں زیادہ کاوش نہ کریں ورنہ سارا وقت اسی میں چلا جائے گا اور سبق نہ ہو سکے گا، سرسری اصلاح روزانہ ہوتی رہے گی تو وہ ذہن نشین ہو جائے گی۔

(۴) **طریقۂ درس**: درس میں لمبی تقریر بالکل نہ کی جائے، عبارت پڑھوائی جائے، عبارت کا ترجمہ قریب قریب تحت اللفظ کرایا جائے تاکہ ہر طالب علم کو معلوم ہو جائے کہ کس لفظ کا کیا ترجمہ ہے، محاورۂ اردو کی بہت رعایت ہوگی، تو طالب علم مفردات کے ترجمے سے محروم ہو جائے گا، عبارت کو مختصر لفظوں میں حل کرنے کی کوشش کی جائے، متوسطات تک طریقہ یہ ہو کہ نپے تلے سہل الفاظ میں سبق کی تقریر کی جائے، اور انھیں الفاظ میں کم از کم تین بار وہ تقریر دہرائی جائے، تقریر دہرانے میں الفاظ وکلمات اور تعبیر واُسلوب میں تبدیلی نہ کی جائے، اس سے طالب علم کا ذہن منتشر ہوتا ہے، اور بار بار ایک ہی انداز میں تقریر کی جائے گی، تو معانی الفاظ سمیت ذہن نشین ہو جائیں گے، ذہین اساتذہ اس باب میں اکثر غلطی کا شکار ہوتے ہیں۔

(۵) **کمزور طالب علم کی رعایت**: جس طرح نماز باجماعت کے بارے میں حکم ہے کہ کمزور تر مقتدی کی رعایت کی جائے، اسی طرح جماعت میں کمزور تر طالب علم کی رعایت کرتے ہوئے سبق پڑھایا جائے، اس طریقۂ عمل سے ذہین طلبہ کو سبق مجلس درس میں ہی ازبر ہو جائے گا، اور کمزور طالب علم بھی اپنی استعداد کے بقدر فائدہ اٹھالے گا۔

(۶) **طالب علم کے ساتھ سلوک** : طالب علموں کی ہمت شکنی ہرگز نہ کی جائے، زجر وتوبیخ میں یہ انداز قطعاً نہ اختیار کیا جائے، جس سے یہ تاثر پیدا ہو کہ یہ طالب علم کسی کام کا نہیں ہے، یا اسے علم حاصل ہی نہ ہوگا، ممکن ہے کسی خاص فن میں یا کسی خاص کتاب میں وہ کمزور ہو، لیکن اس سے یہ بالکل لازم نہیں آتا کہ وہ بالکل ناکارہ ہوکر رہ جائے، کبھی کبھی ہمت شکنی طالب علم کو ہمیشہ کے لئے مایوسی کا شکار بنادیتی ہے۔

(۷) **تعلیمی گھنٹی کی رعایت** : اساتذہ خاص طور سے اس کا اہتمام کریں کہ کسی درس اور کتاب کے لئے جو وقت مدرسہ کی طرف سے متعین ہے، اس پورے وقت میں اپنے آپ کو طلبہ کے ساتھ پابند رکھیں، کسی مشغولیت کی وجہ سے درگاہ پہونچنے میں دیر نہ کریں، ورنہ طلبہ اور زیادہ سست ہوجائیں گے، استاذ جب وقت کی پابندی کرتا ہے تو طلبہ مستعد رہتے ہیں، اسی طرح اگر وقت ختم ہونے سے پہلے سبق پورا ہوجائے اور وقت زیادہ بچ گیا ہے، تو اس کو ضائع نہ ہونے دیں، بلکہ طلبہ کو کسی کام میں مشغول کردیں، اور خود بھی وہاں موجود رہیں، ہاں پانچ منٹ پہلے ضرور انھیں چھوڑ دیں تاکہ وہ دوسرے استاذ کے یہاں وقت پر پہونچ سکیں، ایسا کبھی نہ کریں کہ دوسرے استاذ کے وقت میں اپنا سبق پورا کریں۔ وقت ختم ہونے سے پانچ منٹ پہلے ضروری ہے کہ طلبہ کو فارغ کردیا جائے، اساتذہ اس کا خیال نہیں کرتے، اپنا وقت ضائع کرتے ہیں، اور دوسرے استاذ کے وقت میں بے جا تصرف کرتے ہیں، یہ عمل طلبہ کے حق میں تو مضر ہے ہی، خود اساتذہ کے باہمی تعلقات میں اس سے خرابی پیدا ہوتی ہے۔

ایک بات یہاں اور قابل لحاظ ہے، وہ یہ کہ تعلیم کا گھنٹہ ساٹھ منٹ سے کم نہ ہونا چاہئے، لوگوں نے درس میں کتابیں زیادہ کردی ہیں، اس لئے گھنٹوں کو مختصر کرنا پڑا ہے، اس سے طلبہ کی استعداد پختہ نہیں ہو پاتی، کتابیں بس اتنی چاہئیں کہ ساٹھ منٹ کے حساب سے چھ گھنٹے میں ان کی تکمیل ہوجائے، طلبہ کم ہوں، تو چھوٹی گھنٹیوں کی گنجائش نکل سکتی ہے، لیکن

اگر ایک جماعت میں بارہ چودہ طلبہ ہوں تو ساٹھ منٹ سے کم قطعاً ناکافی وقت ہے، انجام یہ ہوتا ہے کہ خارج میں اسباق پڑھانے پڑتے ہیں، اس سے طلبہ بھی مصیبت میں پڑتے ہیں اور اساتذہ بھی پریشان ہوتے ہیں۔

بہر حال درس میں کتابیں کم ہوں، اور وقت پورا ہو، تو استعداد ٹھوس ہونے کی توقع زیادہ ہے۔

(۸) **اسباق کا مذاکرہ**: طلبہ کو پڑھے ہوئے اسباق کے مذاکرہ کا پابند بنایا جائے، اور ایسا ماحول تشکیل دیا جائے کہ پڑھنے لکھنے کا شوق اور ولولہ پیدا ہو۔

(۹) **مشورہ**: اہل مدرسہ اس کا اہتمام کریں کہ جس تجربہ کار عالم پر اعتماد ہو، اور اس کی ہمدردی اور تعلق کا یقین ہو، اسے کبھی کبھی مدرسہ میں دعوت دے کر تعلیم اور طریقۂ تعلیم کے موضوع پر ان سے رہنمائی حاصل کی جائے، انتخاب بہت احتیاط اور اہتمام سے کریں، اور ایک یا دو عالم کا انتخاب کریں اور ہمیشہ انھیں سے مشورہ لیں، کئی علماء سے اگر استفادہ کیا جائے گا، تو تشتت پیدا ہوگا۔

(۱۰) **اجتماعی تربیت**: مدرسہ میں ایک ذمہ دار استاذ ایسا ضرور ہونا چاہئے، جو انفراداً تربیت کے علاوہ اجتماعی طور پر تربیتی اور ترغیبی باتیں طلبہ میں اچھے انداز میں کرسکتا ہو، کم از کم ایک ماہ میں دوبار اس کا التزام ہونا چاہئے، اس کے فوائد بہت ہیں۔

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ

باتیں تو بہت ہیں، لیکن سب کا قدر مشترک یہ ہے کہ اساتذہ وطلبہ پوری دیانت داری کے ساتھ اس کام میں مشغول ہوں، اساتذہ اسے صرف حصول تنخواہ کا ذریعہ نہ بنائیں بلکہ عبادت سمجھ کر یہ کام انجام دیں، اور طلبہ اس علم کی اہمیت محسوس کریں، کلیدی بات یہی دیانت داری ہے۔

* * * * *

حضرات اساتذہ کیلئے چند رہنما اصول

یہ ایک مکتوب ہے، جو مدرسہ عربیہ اشرفیہ پوہدی بیلا ضلع دربھنگہ
کے حضرات اساتذہ کے نام لکھا گیا۔

حضرات احبابِ کرام و اساتذۂ مدرسہ!

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاتهٗ

مزاج گرامی!

آپ حضرات سے بہت عرصہ ہوا کہ ملاقات نہیں ہوئی، اور اِدھر مستقبل قریب میں بھی ملاقات کے آثار نہیں محسوس ہوتے، حضرت اقدس ناظم صاحب مدظلہٗ نے مدرسہ کی بابت چند کلمات تحریر فرمائے تھے، اس سے تأثر ہوا، تو بے اختیار جی چاہا کہ حضرت کی خدمت میں جو لکھنا ہے وہ تو خیر ہے ہی، آپ حضرات سے بھی چند باتیں عرض کردوں، گوکہ میری ایسی کوئی حیثیت نہیں ہے کہ آپ حضرات کو براہ راست مخاطب کرسکوں، میں بھی ایک مدرسہ کا مدرس ہوں، آپ حضرات بھی میری طرح مدرسہ اور علم دین کی خدمت گزاری میں لگے ہوئے ہیں، جو باتیں میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں، ان کا میں اس سے زیادہ محتاج ہوں، جتنے آپ حضرات محتاج ہیں، ہاں یہ جانتا ہوں کہ آپ حضرات کو مجھ سے محبت ہے، اور خصوصی محبت ہے، اور میں بھی دل سے آپ کی قدر کرتا ہوں، بس یہی چیز ہے جس نے براہ راست تخاطب پر آمادہ کیا ہے، مجھے امید ہے کہ میری کسی بات سے آپ کو ناگواری نہیں ہوگی، کیونکہ محبت، تلخیوں کو بھی گوارا بلکہ خوشگوار بنا دیتی ہے۔

سب سے پہلی بات تو مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ آپ حضرات معلم و مربی ہیں، جن لوگوں سے متعلق تربیت کا کام ہو، انھیں دوسروں کی تربیت سے پہلے خود اپنی تعلیم و تربیت پر نگاہ رکھنی ضروری ہے، آپ کسی وقت یہ تصور دل میں نہ لائیں کہ آپ کی تعلیم و تربیت ہو چکی، اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ نہیں، علم میں اضافہ کی کوشش کرتے رہنا چاہئے، اور اخلاق تو ایسی چیز ہے کہ زندگی بھر اس میں کوئی نہ کوئی عیب دکھائی دیتا رہے گا، پوری توجہ کے ساتھ اپنے علم واخلاق کو بڑھانے اور سدھارنے کی محنت میں لگے رہئے۔ علماء و اساتذہ کیلئے اخلاق کی بنیاد دو چیزیں ہیں، تواضع اور ترکِ حسد۔ یہ بنیاد اوروں کیلئے بھی ہے، مگر طلبہ و اساتذہ کیلئے اس کی حیثیت خصوصی بنیاد کی ہے، تواضع کا مطلب یہ کہ آدمی اپنی کوئی فضیلت دوسروں پر نہ سمجھے، اور اس کی اصل یہ ہے کہ آدمی غلام اور بندہ ہے، غلاموں کی نگاہ ہمیشہ اپنے مالک پر ہوتی ہے، مالک کے سامنے ہوتے ہوئے، کوئی غلام، اپنے جیسے غلام پر فوقیت جتلانے کی جرأت نہیں کرتا، اور یہ تو آپ اپنے شاگردوں میں بھی دیکھتے ہیں کہ آپ کے سامنے کسی طالب علم کو جرأت نہیں ہوتی کہ دوسرے طالب علم پر برتری ظاہر کرے، اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو آپ کے غصہ کی حد نہیں رہتی، بس یہی حال ہمارا اللہ کے سامنے ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ مالک ہیں اور ہم غلام ہیں، اور ہمہ وقت اللہ کی نگاہ میں ہیں، ایسی حالت میں یہ بات بہت نازیبا ہے کہ ہم کسی پر بڑائی ظاہر کریں، اس ضابطہ میں وہ بھی شامل ہیں، جو ہم سے عمر، علم اور مرتبے میں بڑے ہیں، اور وہ بھی داخل ہیں، جن کو عرفاً ہمارے برابر سمجھا تا ہے، اور وہ بھی شامل ہیں جو ہم سے چھوٹے ہیں، یعنی طلبہ و اولاد وغیرہ۔ البتہ یہ ہے کہ ہر ایک کے ساتھ تواضع کا رنگ جدا جدا ہوگا۔ لیکن بہر حال اپنے کو جھکا کر رکھنا ہی عبدیت ہے، آدمی کو جب یہ تصور قائم ہو جاتا ہے کہ سب سے چھوٹا میں ہی ہوں، تو بہت سے رذائل خود بخود دفع ہو جاتے ہیں، تواضع کی ضد کبر ہے، کبر سے غصہ، غیض و غضب، جوشِ انتقام، ظلم وغیرہ پیدا ہوتے ہیں، تواضع آجائے تو یہ دشمنانِ دین و اخلاق اپنے آپ بھاگ کھڑے

ہوتے ہیں، تواضع ہر حسن خلق کی بنیاد ہے، اور حسن خلق پر اللہ کی رحمت برستی ہے، اور بدخلق سے اللہ کی رحمت دور ہو جاتی ہے، اور ہم کو مدرسہ میں رہ کر اللہ کی رحمت کی کس قدر ضرورت ہے، وہ محتاج بیان نہیں ہے، یہاں پر ہماری کوئی آمدنی تو ہے نہیں، سوائے اس کے کہ لوگوں کے ذریعے ہماری روزی مہیا کرائیں، اور ہمارے کام کے لئے اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں ڈالیں کہ وہ اپنے بچوں کو ہمارے سپرد کر جایا کریں۔ پس جو کچھ ہم کو مل رہا ہے۔ خواہ وہ ہماری معاش ہو، یا ہمارے طلبہ ہوں، یہ سب براہ راست اللہ کی رحمت کا کرشمہ ہے، اس میں ہماری قوت بازو کا کوئی دخل نہیں ہے، جب یہ ہے تو ہم پر قطعی لازم ہے کہ صرف وہی کام کریں، جس سے اللہ کی رحمت برسا کرے، اور ہر اس کام سے دور رہیں، جس سے نزول رحمت میں رکاوٹ ہوتی ہو۔

اور حسد کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی دوسرے کی نعمت کا زوال چاہے، یہ فی الحقیقت اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرنا ہے، خواہ دل سے خواہ زبان سے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں کو فلاں نعمت سے کیوں نوازا۔ اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرنا کس قدر مہلک ہے، کوئی مسلمان اس سے ناواقف نہیں ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ یہ مرض علماء واساتذہ میں بڑا طاقتور ہوتا ہے، اگر ان دونوں دشمنوں سے نجات مل جائے تو مدرسہ کی فضا جنت بن جائے۔

(۲) تعلیم وتدریس ایک ایسا منصب ہے، جو خدا کی طرف سے سونپا جاتا ہے، اس کا عوض اور معاوضہ اللہ کے ذمے ہے، اسی لئے بعض ائمہ کے نزدیک تعلیم پر اجرت لینا سرے سے جائز نہیں ہے، لیکن انسانی کمزوری کو دیکھتے ہوئے، ایک دنیاوی معاوضہ بھی طے کر دیا جاتا ہے، تعلیم کسب معاش ہرگز نہیں ہے، اسی لئے تعلیم وتدریس کا مدار اس ضرورت پر کبھی نہیں رکھنا چاہئے، یہ اہل انتظام کی ذمہ داری ہے کہ بقدر وسعت اس کی تکثیر کا اہتمام کریں، لیکن اساتذہ کو تعلیم تو خالصاً لوجہ اللہ دینی چاہئے، اور اس کے بعد جو کچھ بقدر قُوتِ لَایَمُوت مل جائے، اللہ تعالیٰ کا اس پر شکر گزار ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ اپنے خادموں کو کبھی

رسوا نہیں کریں گے، مال کی بہتات تو نہیں ہوگی، لیکن واقعی ضروریات بھی کبھی بند نہیں ہوں گی۔ حرص وطمع سے الگ ہوکر بے نیازی کے ساتھ دین کی خدمت کیجئے، زیادہ دن نہیں گزرے گا کہ دنیا قدموں پر نثار ہونے لگے گی۔ مجھے اس کا خوب تجربہ ہے، مال کی حرص نے علماء کے وقار کو پامال کررکھا ہے، عوام میں ان کا پانی اتر گیا ہے، اگر یہ مستغنی ہوتے، اپنے فقر وفاقہ پر صبر ورضا کے ساتھ دین کی خدمت کرتے ہوتے تو کسی کی مجال نہ تھی کہ انھیں توہین وذلت کی نگاہ سے دیکھتا۔

(۳) اساتذہ نائب رسول ہیں، اور طلبہ مہمان رسول ہیں، اب یہ سوچئے کہ اگر یہ طالب علم حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے، بلکہ انھیں الگ کرکے خود اپنے بارے میں سوچئے کہ ہم اگر طالب علم بن کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو ہم آپ کی طرف سے کیا سلوک پاتے۔ یا ہم آپ سے کیا سلوک چاہتے، رسول اللہ ﷺ کا برتاؤ تو اپنے شاگردوں اور صحابۂ کرام کے ساتھ کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے، دنیا جانتی ہے کہ آپ نے ہمیشہ اپنے لوگوں کے ساتھ شفقت کا معاملہ کیا ہے، حضرت انسؓ جنھوں نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت دس سال کی عمر سے کی ہے، نہ جانے کتنا کتنا کام بگڑتا رہا ہوگا، مگر فرماتے ہیں کہ مارنا تو درکنار حضور اکرم ﷺ نے کبھی مجھے ڈانٹا اور گھڑکا تک نہیں، اگر کوئی ڈانٹتا تو اسے منع کردیتے، رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا تھا کہ میرے بعد تمہارے پاس دور دراز سے آدمی علم حاصل کرنے آئیں گے، ان کے سلسلے میں خیر اور بھلائی کی نصیحت کرتا ہوں، اس کو تم قبول کرو، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہئے کہ اپنے مہمان کا اکرام کرے، جب اپنے مہمان کا اکرام کرنا ایمان کا تقاضا ہے تو رسول اللہ ﷺ کے مہمانوں کا کس قدر ضروری ہوگا، ان کو ایذا ہوگی، تو رسول اللہ ﷺ کو ایذا ہوگی، اور ان کو راحت ملے گی تو رسول اللہ ﷺ خوش ہوں گے، اس سلسلے میں اساتذہ سے بہت کوتاہیاں ہوتی ہیں، اول تو طلبہ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، یہ بدترین جرم ہے، یہ گو

بچے ہیں، نادان ہیں، ناواقف ہیں، لیکن دل میں ان کی تحقیر ہرگز نہیں ہونی چاہئے، یہ جس کام کیلئے آئے ہیں، اس نے ان کا مرتبہ بڑھا دیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے بچوں کے ساتھ جو شفقت کی ہے، ہم جو طلبہ کے ساتھ برتاؤ کریں تو وہی شفقت اس میں جھلکنی چاہئے، ورنہ نیابت چھن جائے گی، نائب رسول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہی کام کیا جائے جو اصل اور منیب کے منشاء کے مطابق ہو، ہمارے بزرگوں نے اس کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ واقعات تو بے شمار ہیں لیکن میں صرف ایک واقعہ تحریر کرتا ہوں، جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے اکابر طلبہ کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے۔

دیوان عبد الرشید جونپوری قدس سرہٗ سلسلۂ قلندریہ کے بہت بڑے شیخ ہیں اور بہت بڑے عالم بھی، انھوں نے زندگی بھر خانقاہ کے ساتھ مدرسہ کا بھی سلسلہ بھی جاری رکھا، انتقال کے وقت وصیت کی کہ ان کی قبر میں وہ پتھر رکھ دیا جائے جس پر طلبہ اپنے جوتے اتارا کرتے تھے، مجھے اس کی برکت سے نجات کی امید ہے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، خیال فرمائیے ان کے دل میں طالب علم کی کیا وقعت تھی؟ ایک واقعہ اور سن لیجئے! حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ قدس سرہٗ طلبہ کو پڑھا رہے تھے، صحن مسجد میں سبق ہو رہا تھا کہ اچانک بارش شروع ہوگئی، سب طلبہ کتابیں لے کر اندر بھاگے، اندر پہونچ کر تپائیاں درست کر کے دیکھا تو ایک عجیب منظر نظر آیا، وقت کا یہ محدث اعظم، استاذ العلماء، مرجع الخلائق، شیخ طریقت، ولی کامل اپنے طالب علموں کے جوتے اٹھا اٹھا کر سائے میں رکھ رہا ہے کہ وہ بھیگنے نہ پائیں، اللہ اکبر کس قدر تواضع تھی، اور دل میں کیسی طلبہ کی عظمت تھی، یہ نمونے اگر عام ہو جائیں تو ہماری کتنی خرابیاں دور ہو جائیں۔

دوسرے یہ کہ طلبہ سے ان کے تحمل سے زیادہ کام نہ لیا جائے، نہ علم کے سلسلے میں اور نہ خدمت کے سلسلے میں، ان سے کوئی ایسی فرمائش نہ کی جائے جس کو وہ نہ سمجھ سکیں، یا سمجھ لیں تو کرنے میں انھیں دشواری ہو۔ وہ ہمارے غلام نہیں ہیں، عموماً حضرات اساتذہ کو اس کا

اہتمام نہیں ہوتا، کبھی طلبہ سے ناصاف گفتگو میں کوئی فرمائش کردیتے ہیں، وہ اسے سمجھ نہیں پاتے، اور مارے ڈر کے پوچھ نہیں پاتے، اور بعد میں انھیں زجر وتوبیخ اور بعض اوقات ضرب وتنبیہ کا نشانہ بننا پڑتا ہے، یاد رکھئے کہ طلبہ کی غلطیوں کو آپ معاف کریں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کی غلطیوں کو معاف کریں گے، اور اگر آپ ان کی ہر غلطی پر گرفت کریں گے اور سزا دیں گے تو اللہ تعالیٰ بھی ایسا ہی کریں گے، طلبہ کی تعلیم میں بے حد تحمل ہونا چاہئے، مارنا بالخصوص نابالغ بچوں کو بہت ناپسندیدہ امر ہے، بچوں کو زدوکوب سے نہیں پیار ومحبت سے پڑھانا چاہئے، زدوکوب کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ان کا دل تعلیم سے اچاٹ ہوجاتا ہے، نہ جانے کتنے لوگ اپنے اساتذہ کی مار پیٹ کی وجہ تعلیم سے بھاگ نکلے، اس کا حساب کون دے گا، میں مطلقاً مارنے کا انکار نہیں کرتا، لیکن بقدر ضرورت ہو اور بے تحاشا مارنے کی ضرورت میں تسلیم نہیں کرتا، اور میں کیا، اللہ اور رسول تسلیم نہیں کرتے، ہم انھیں تعلیم دیتے ہیں، اور ثواب کی امید رکھتے ہیں، ہم انھیں مارتے ہیں اور بے تحاشا مارتے ہیں، اور تمام ثواب کو آگ لگا دیتے ہیں، اوپر سے ظلم کا گناہ لاد لیتے ہیں، ان بچوں کی طرف سے کوئی ہم سے سوال کرنے والا نہیں ہے۔ یاد رکھئے کہ ان کا وکیل اللہ ہے، اللہ کا رسول ہے، اللہ کے دربار میں اگر رسول نے دعویٰ دائر کردیا تو بچنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی، اگر ہم کو یہ خیال ہو کہ یہ بچے رسول اللہ ﷺ کے مہمان عزیز ہیں تو ہمیں ہرگز جرأت نہ ہوگی کہ ان پر ہاتھ اٹھائیں، اگر کوئی طالب علم ہماری شفقت کے باوجود نہیں پڑھ سکا تو انشاء اللہ ہم سے اس کا مواخذہ نہ ہوگا، اور اگر ہماری سختی اور مار پیٹ کی وجہ سے تعلیم سے ہٹ گیا تو دوہرا مواخذہ ہوگا، ایک بے جا سختی کا، دوسرے اس کی تعلیم کے خراب ہونے کا، اور اساتذہ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ ان کا بے تحاشا پیٹنا کسی ہمدردی کی وجہ سے ہوتا ہے، عموماً ایسا شفائے غیظ کیلئے ہوتا ہے، اس چیز سے میں بہت خطرہ محسوس کرتا ہوں۔

مشہور شاعر علامہ اقبال مرحوم نے مثنوی ''رموزِ بے خودی'' میں اپنے بچپن کا ایک

واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک سائل بھیک مانگتا صدا لگاتا ہوا ان کے دروازے پر آیا، یہ گدائے مبرم یعنی اڑیل فقیر تھا، دروازے سے ٹلنے کا نام ہی نہ لیتا تھا، اس کے بار بار چیخ کر صدا لگانے پر علامہ اقبال نے طیش میں آ کر اسے مارا، اور اس مار پیٹ میں فقیر کی جھولی میں جو کچھ تھا، زمین پر گر گیا، علامہ کے والد اس حرکت پر بہت آزردہ اور کبیدہ خاطر ہوئے، اور دل گرفتہ ہو کر بیٹے سے کہا کہ قیامت کے دن جب خیر الرسل ﷺ کی امت سرکار کے حضور جمع ہوگی تو یہ گدائے دردمند تمہارے اس برتاؤ کے خلاف حضور رسالت مآب ﷺ سے فریاد کرے گا، اس وقت۔

اے صراطت مشکل از بے مرکبی   من چہ گویم چوں مرا پُرسد نبی
حق جوانے مسلمے باتو سپرد   کو نصیبے از دبستانم نبرد
در ملامت نرم گفتار آں کریم   من رہین خجلت وامید وبیم
باز این ریش سفیدِ من نگر   لرزہ ٔ امید وبیمِ من نگر
از تو ایں کارِ آساں ہم نشد   یعنی آں انبارِ گل آدم نشد
اند کے اندیش ویاد آر اے پسر   اجتماع امت خیر البشر
بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن   پیش مولیٰ بندہ را رسوا مکن

یعنی اے اقبال! بغیر سواری کے راستہ قطع کرنا مشکل ہے۔ مجھ سے نبی ﷺ پوچھیں گے، تو میں کیا کہوں گا، وہ پوچھیں گے کہ حق تعالیٰ نے تم کو ایک جوان مسلمان بیٹا سپرد کیا تھا، لیکن اسے میرے دبستان سے کوئی حصہ نہیں ملا۔ (تم سے اتنا آسان کام بھی نہ ہو سکا کہ، یعنی مٹی کا ڈھیر تمہاری تربیت میں رہ کر آدمی نہ بن سکا) نبی کریم ﷺ تو نرم گفتاری سے مجھے ملامت کریں گے، لیکن میں شرمندگی اور امید وبیم میں غرق ہوں گا، میرے بیٹے! ذرا اس وقت کو سوچو تو سہی، جب خیر البشر ﷺ کی امت اکٹھا ہوگی، پھر میری سفید داڑھی کو دیکھو اور امید وبیم کے درمیان میرے لرزنے کو دیکھو، باپ کے اوپر یہ نازیبا ظلم مت کرو، مولیٰ کے

سامنے اس بندہ کو رسوا مت کرو۔

واقعی معاملہ سخت ہے، یہ بچے اگر کل قیامت کے دن دامن گیر ہوں گے تو جان مشکل میں پڑ جائے گی، ان کے ساتھ طاقت کا استعمال کم سے کم کرنا چاہئے، ہاں! روحانی طاقت، یعنی اخلاق وانسانیت سے زیادہ کام لینا چاہئے، اس سلسلے میں حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی کا قصہ بھی بہت عجیب ہے۔ یہ مولانا فضل حق، ہدیہ سعیدیہ کے مصنف، زبردست عالم ہیں، منطق وفلسفہ اور ادب کے امام ہیں، ان کے والد گرامی مولانا فضل امام صاحب بھی بڑے عالم تھے۔ منطق کی مشہور کتاب ''مرقات'' انھیں کی تصنیف ہے، طلبہ پر بے حد شفقت فرماتے تھے، ان کے ایک شاگرد مولانا غوث علی شاہ تھے، بڑے آزاد مزاج اور دنیا جہاں کے سیاح! وہ بیان کرتے ہیں کہ جب ہم رامپور گئے تو مولانا فضل حق صاحب سے ملاقات ہوئی، ایک روز پچھلی باتوں کا ذکر آ گیا، اپنے والد بزرگوار (مولانا فضل امام صاحب) کو یاد کر کے روتے رہے، ہم نے کہا، مولوی صاحب، آپ کو وہ دن بھی یاد ہے کہ موکوی صاحب نے تھپڑ مارا تھا اور آپ کی دستارِ فضیلت دور جا گری تھی، ہنسنے لگے اور فرمایا کہ خوب یاد ہے، وہ عجیب زمانہ تھا، اور وہ قصہ اس طرح تھا کہ مولانا فضل امام صاحب نے ایک طالب علم سے فرمایا کہ جاؤ فضل حق سے سبق پڑھ لو، وہ تھا غریب آدمی، بدصورت، عمر زیادہ علم کم، ذہن کند، یہ نازک طبع، ناز پروردہ، جمال صورت ومعنیٰ سے آراستہ، چودہ برس کا سن وسال، نئی فضیلت، ذہن میں جودت، بھلا میل ملے تو کیسے ملے، اور صحبت راس آئے تو کیوں کر آئے، تھوڑا سبق پڑھا تھا کہ بگڑ گئے، جھٹ اس کی کتاب پھینک دی، اور برا بھلا کہہ کر نکال دیا، وہ روتا ہوا مولانا فضل امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اور سارا حال بیان فرمایا، فرمایا: بلاؤ اس خبیث کو، مولوی فضل حق صاحب آئے اور دست بستہ کھڑے ہو گئے، مولانا صاحب نے ایک تھپڑ دیا اور ایسے زور سے دیا کہ ان کی دستار فضیلت دور جا پڑی اور فرمانے لگے، تو ظالم عمر بھر بسم اللہ کے گنبد میں رہا، ناز ونعمت میں پرورش پائی، جس کے

سامنے کتاب رکھی اس نے خاطر داری سے پڑھایا، طالب علموں کی قدر و منزلت تو کیا جانے، اگر مسافرت کرتا، بھیک مانگتا اور طالب علم بنتا تو حقیقت تو معلوم ہوتی ارے طالب علمی کی قدر ہم سے پوچھو، خیر بھلا جانو گے، اگر ہمارے طالب علموں کو کچھ کہا، یہ چپ کھڑے روتے رہے، کچھ دم نہیں مارا، خیر قصہ رفع دفع ہوا، لیکن پھر کسی طالب علم کو کچھ نہیں کہا۔ میرا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو بچوں کے ساتھ شفقت ومحبت کا برتاؤ کیا جائے، انھیں خوفزدہ نہ کیا جائے، نہ جانے ان میں کل کون کیا ہونے والا ہے، حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے ایک استاذ نے طالب علمی کے زمانہ میں انھیں تھپڑ رسید کیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد کسی نے دیکھا کہ ان کا وہ ہاتھ سوکھا ہوا ہے، دریافت کرنے پر انھوں نے بتلایا کہ عبدالقادر کو اس ہاتھ سے تھپڑ مارا تھا، اس کی یہ سزا ملی ہے۔ اس نے شیخ سے جا کر عرض کیا، شیخ ان کی قبر پر تشریف لے گئے، اور بارگاہ الٰہی میں بہت کچھ مناجات کی، جب ان پر سے یہ سزا ہٹی، بچپن میں بسا اوقات اندازہ نہیں ہوتا کہ کل اس طالب علم کا کیا رتبہ ہوگا، یہاں بہت احتیاط کرنے کی ضرورت ہے، بات ذرا لمبی ہوگئی، لیکن دیکھتا ہوں کہ حضرات اساتذہ اس باب میں بے اعتدالی کا شکار ہو جاتے ہیں، اسی لئے ذرا تفصیل کے ساتھ عرض کردیا اور بعض لوگ تعلیم وتربیت کے حق میں دوسری کوتاہی کرتے ہیں، وہ یہ کہ طلبہ سبق یاد کریں یا نہ کریں، نماز پڑھیں یا نہ پڑھیں، اخلاق خواہ ان کے کیسے ہی ہوں، وہ سرے سے روک ٹوک کرتے ہی نہیں، یہ بھی غلط ہے، انھیں اپنی اولاد کی طرح پالنا پوسنا چاہئے، ان سے غلطی ہو رہی ہو تو روکنا چاہئے اور بار بار چاہئے، یہ نہیں کہ ایک دو مرتبہ روکا پھر اکتا گئے، نہیں بلکہ جتنی بار ان سے غلطی ہو اتنی بار ٹوکئے، مگر نرمی سے اور ایسا بھی نہ ہو کہ بالکل پیچھے پڑ جانا محسوس ہو۔ تربیت کا مسئلہ ذرا نازک ہے، تاہم روک ٹوک کرتے رہنا چاہئے، اس سے برائی سمٹتی ہے، اور اگر اسے چھوڑ دیا جائے تو برائی کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جائے گا، کچھ اور لکھنا چاہتا تھا، مگر یہاں آکر طبیعت بند ہوگئی، قلم رک گیا، بہت سوچا کہ اور کیا لکھنا چاہئے، مگر کچھ سمجھ میں نہیں

آیا۔ اب تک بے تکلف لکھا تھا، اب تکلف ہوتا، اس لئے اس تحریر کو ختم کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ حضرات کی شان میں کوئی نازیبا بات میرے قلم سے نکل گئی ہو تو اسے معاف کریں گے، آپ حضرات کیلئے دعا گو ہوں اور دعاؤں کا ملتجی ہوں۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۱۳؍ ذوقعدہ ۱۴۱۶ھ

* * * * *

مدارس، اقبال کی نگاہ قدر شناس میں

’’ان مکتبوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو انھیں مدارس میں پڑھنے دو، اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوگا میں انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، اگر ہندوستانی مسلمان ان مدرسوں کے اثر سے محروم ہوگئے تو بالکل اسی طرح ہوگا جس طرح اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج **غرناطہ** اور **قرطبہ** کے کھنڈرات اور **الحمراء** کے نشانات کے سوا اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلی لال قلعے کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا‘‘۔

علامہ اقبالؒ